



ناول — پرئی زاد: یہ دنیا ٹھایر پرستوں کا ڈیرہ ہے۔

من کشائی میلا کیوں نہ ہوتی اجلا ہوتا چاہیے، انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی توقعات ہیں، دنیا کے بد صورت آئینوں کے مقابل..... اک حسن پرست کا فسانہ..... ہاشم نadeem

Novel: PariZaad  
Written by: Hashim Nadeem  
Compiled by: Muhammad Bilal Ashraf

**All Episodes: 1 - 28**

Hashim Nadeem khan is a Baloch play writer whose literary services recently awarded by "Poona festival award". The famous baloch writer Hashim Nadeem was born in Quetta and got his early education from there. He obtained his intermediate education from cadet college Pataro and entered in the field of medicine. After getting medicine education from Bolan medical college of Quetta he involved himself in Blochistan civil service as assistant commissioner.

PariZaad was Published in Jang Sunday Magzine.

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منسلک کے معروف و منفرد اداکار، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دھبہ“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدرتی کچے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ”ہمارے“ نئے ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتہ ای پرا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھروڑ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ”میرے محبوب یہ تیری یک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے..... مگر تجھے مجھ سے چھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں چھڑ.....“ اس بار کا موسم گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے، دھیرے دھیرے قسطوں میں چھڑنے کے جن کر رہا تھا۔ تیز گرم بھٹی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنان سڑک کسی سیاہ گلیشیر سے پھسلتی ہوئی پھیل چکی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جوتوں کا کوا نیچے سے کئی جگہ سے گھل چکا تھا، لہذا اہلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں انگارے بھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پہلا صراط مجھے ہر روز ہی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دسبہ لنگھوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شام کی حد سے نکلنے جا رہے ہیں، مگر لو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا مہرٹ لگلا جاتا تو میری عرضی کا نمبر چھٹا تھا اور اپا کی تحوہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسب معمول چھٹھوں کے لیے جوتوں کی بڑی دکان کے پچھترے سستانے کے لیے ٹھہرا اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے بخش کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کٹورا بنا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر چاچ کر رہا تھا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دو دھ میں دھلی، آب شام کی جلیترنگ کی مانند گھری گھری سی..... مگر خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور حقارت بھرے لہجے میں مجھے تھڑکنے لگا۔ ”اے اکتی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گندا کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔“ میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بٹ سنہالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و حقارت، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا لگ، شکوہ، میری صورت، میرا اعلیٰ ایسے رویے، ایسی ہی نفرت و حقارت کا شکار تھی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ اب ایک شربت پیک کرنے والی کپہنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو ستھنے کے ڈبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصے کا جن کھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کو نوں کھدروں میں دیک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تحوہ، ضروریات، مہنگائی اور سہ سے نو سچوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غریب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آگن بچوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ ثانی ثانی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسب معمول کم خوراک کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سالو لے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاہی میرے مقدور کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خال کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ”آئے ہائے ہائی! یہ اتنا کالا کھونا سا بچہ کس پر چلا گیا، لگتا ہے، جیسے آگن میں اماں کی رات اتر آئی ہے۔“ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، تھلا ہی تو گئیں ”جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد۔ ویسے تمہاری اس بھنگی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔“ اب چلنے کی باری خال کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ”ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ تھا ہے تم نے۔“ اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ”ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔“ ”پری زاو“ ہاں، بس یہی نام ہوگا، میرے سچے کا۔“ ”پری زاو“ اس پاس موجود سب ہی عورتیں زیر لب بڑبڑائیں اور کن آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ”پری میکر تو نہ تھا، یہ پری زاو بھلا کیا نام ہوا۔“ بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تحسّر، طنز اور حقارت لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اس روز اماں چھوٹی خال کے طنز کے جواب میں خاموش رہیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر دلکش نیم نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاو کے نام سے کروایا جاتا تو سننے والا خود بخود تہجد لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچوں کو فرداً فرداً کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر مصیبت سے اچانک نام بتایا۔ ”پری زاو“ استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور خلیے کو دیکھتے رہے، پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ ”واہ شہزادے..... نام تو بڑا کمال رکھا ہے، ماں باپ نے.....“ استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا گئی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچنبھے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اُس وقت ایک ناکچھ بچہ تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس دولتی دنیا میں انسان کا من چاہے، جتنا بھی میلا ہو، شین ضرور اُجلا ہوتا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے۔ روح کا اُجلا پن اور خوب صورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں.....؟

میری بد نصیبی کی داستان بسکے ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر ہی سے میرے من میں ننھی ”خوب صورتی کی چاؤ“ کو اُس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں قاتی تھیں کہ بھری پُری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اُنہی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس محفل میں سب سے اچلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہروں تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بادل۔ کوئی دھن ہو، پارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویریں کی دکان کے باہر گھٹنوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور ہی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر مجھ جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر ایسی یہ حسرتی تو جیسے ڈہرا عذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بد صورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بد صورتی ہی چھٹی ہے۔ سو، میرے اُس پاس بھی ہر لمحہ وہ بد صورتی ہی چھٹکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اُٹی گلیاں، دھول اڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بد صورت سوچ اور نظریں۔

اس پر مگر فوجی شایہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اُس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول ہی نہیں جایا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجب سے سرخ سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چلا کر ابا سے کہا کہ ”پری زاو کے باوا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟“ ابا بھگم بھگم مجھے لیے سرکاری اسپتال ٹیکا لگوانے پہنچ تو گئے، مگر تب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند ہفتوں بعد زخموں کا کھربڑا اترا تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چچک کے بد نما دانوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان دانوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر بیمار داری کرنے اور اماں سے ہم دروی جتانے آتے تھے، مگر اپنی مذاق کی تہ میں، طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل پھٹتی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایماہاد کر کے جالی پھیلانی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ انٹیم بم کے موچہ کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا پر پاد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتفاق تصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں بچے بعد دیگرے اوپر بچے نوپنے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بد قسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹنے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خارزار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے ٹھپٹا، اتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلٹا وہ ایک حسرت پرست پری زاو، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر بھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھاؤ رکھنے والی امیدیں، گرم تپتی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں آنسو میں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، مگر میں دوا فرادکا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور محن میں آ گئے، چھوٹے سے گھر کی تقسیم کشی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں ہاتھیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سٹائی دے جاتی ہے۔ لہذا دھیرے دھیرے ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیاں ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچتا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔



بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی حریز آبادی بڑھی تو ہم سب کو حریز کا دیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے گھنٹن میں اور میں جو گھنٹن میں ہوتا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام ٹما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر نہیں اور مٹی کا تانہ چھوٹا سا کمرہ گھر کا کٹھ کباڑ جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شے کو فالتو کچرا سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام "قیمتی اشیاء" ایک طرف سلپتے سے لگا کر اپنی پرانی چار پائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے گھنٹن کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ غلن کی محسوس ہوتی، مگر پھر دیر دیر سے اپنی اس تنہائی سے سکون ملنے لگا۔ یہ تنہائی میرے پورے وجود میں سرایت کرنے لگی اور پھر جیسے میری، اپنی اس تنہائی سے دوستی ہی ہو گئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ میسر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بد صورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنادیتی، جو ضلع بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کچھ کچھ بھرے ہال میں بیڈ ماسٹر سے فرائی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کامیابی پر سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب کچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں، ہمیں ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر فصاحتی سرگرمیاں تو ذرا، کبھی تصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لیتے تو میری ناگہانیاں کاٹنے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں گن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں ملے ہوئی اور اس کے شسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ابا کو رخصتی کی ہامی بھرتے تھی۔ ہماری برسوں کی گلی بندھی زندگی کی روئین میں ایک ڈرامی فیل پید ا ہوئی اور اماں نے آس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں ہالیوں کو ڈھونڈنے کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈر بے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالاں کہ دل بہت چاہتا تھا کہ گھنٹن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور مچا دوں اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی فحش اور قہقہوں کی آواز اوپر سرے تک آتی، تو کئی بار چھت کی منزل تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ گھنٹن کی کھجلی جانب سے نیچے اترتا۔

ان دنوں سر شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے ارد گرد منڈلاتے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ عہد بہت دیر میں کھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ "گلی یا تارا" کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ "یارا کیا ہوا، وہ آئی کہ نہیں؟" "کہاں یارا اس کا تو گھر سے لٹکانا ہی عذاب ہو چلا ہے، تو بتا تیری والی آئی کہ نہیں؟" "ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی لڑکی گھرائی ہے آج کل اس پر، سوچتا ہوں، خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کر دوں۔" میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سننا اور رشک سے ان سب کو دیکھ کر تا، میری نظر میں وہ سب لوہر بہت عقیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے۔ عاشق تو لاکھ مل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاؤ و ناوری کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان بکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو درکنار، کبھی ایک اپشتی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب زور کے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھنے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ "بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان مجھے بیٹھنے ہو؟" ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اپشتی نگاہ مجھ پر پڑی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا "یار پری اجلدی سے جا کر ایک ڈیپا کیپسن کی تو پکڑ لا۔" ہم سب غم کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے بچھپ کر سرگرمی چننا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرر تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی اونٹنی درجے کے رقیب کے عہد سے پر ہی فائز ہو سکوں۔

ان دنوں محلے میں تابعدا نامی لڑکی کا بہت جھجکا تھا۔ محلے کے کبھی لڑکوں کی فینڈس حرام کر رکھی تھیں، اس پر ہی چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھینڑ کی بنیادی وجہ بھی تابعدا ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پر اور حشمتی اور سے تابعدا کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے گھنٹن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے لٹھا تو گھنٹن میں میٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ڈرامائیجیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس ختم گئی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، تابعدا ہی تھی۔

(جاری ہے)



پاشم ندیم نو جوان اسٹیل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما ماٹرو، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دھبہ“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی دقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدر رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز کی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عجیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رشتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کروا کر گزشتہ مہینے کا ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا گھن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک بل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ گھٹی چکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی بل زمین میں گر گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یا رعب، لحاظِ حسن، یا رعبِ حسن بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابل یقین اور ان ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کرایل جوانوں کو تہتی دوپہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے چلتے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ محال ہے، جو آج تک کسی نے اسے نگے نہ دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھروالے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا تو عام طور پر چھوٹے، بہن بھائی سب متناچت کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ”اے..... تو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر دوبارہ پوچھا۔ ”آپ خالہ منراں کے بیٹے ہیں ناں۔ پری زاد۔“ ”میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پری تو آپ ہیں، میں تو صرف زاد ہی زاد ہوں۔ مگر میرے مطلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔“ جی.....“ ”آپ ذرا اس شادی کے ہنگام سے فارغ ہو لیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگا لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا چکی تھی، مگر میرے قدم تو جیسے وہیں محن کی جگہ زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گزروں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہیں حقیقت بھی ہو سکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکارتے، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

میں جیسے کسی ظلم کے زیر اثر یا ہر گلی میں نکلا تو حسب معمول لفظوں کی ایک نئی گلی کے کھڑ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کرایل اور خور و جوان، میرے ہم عمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماجد کی چیز باؤٹنگ اور ہوا میں اڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم سبھی تماشا کی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں چپ چاپ کھڑ پر کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قریب اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیز کی وجہ سے ناہید کے نام لگتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکر جاناں جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ”یار! تا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے.....“ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”کہاں یار..... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ نکلیں گے“ پھر اچانک ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”اے پری زاد..... تو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے.....؟“ ”سب لڑکوں نے ماجد کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔“ میں نے..... نہیں تو.....“ ”ماجد تنجید ہی شکل بنا کر بولا۔“ ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔“ اکرم نے شراست سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجہ میں بولا۔ ”صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماجد۔“ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلہ جانا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج یہ بتا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ انا

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چار پائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آکر اس جھلکا سی چار پائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر کھیلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جس کے لیے اس "ستارہ جبین" نے مجھے اپنے کمرے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازیگر ہمیں گھسلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل کر ماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازیگر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازیگر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چمک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھا سے انجان دادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں "خواب" کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے رخصتی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر رخصتی کے ٹھیک دوسرے دن چھٹکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا بچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محلے میں مشہور تھا۔ "ہاں بھئی، کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟" انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے تو بکھلا ہٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ "اب کچھ بولو گے بھی یا اونچی منہ میں گھٹکنیاں ڈالے کھڑے رہو گے۔۔۔۔۔؟" میں گھسکھسایا "جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ مجھے بلایا تھا خالہ نے۔۔۔۔۔" انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے سر تک غور سے دیکھا۔ "اندرا آ جاؤ۔۔۔۔۔" میں اس وقت کوکوس رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، بہر حال اب والچی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آگئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نوں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدمے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک مل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عموں روپے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات طرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ ماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ بچا تو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگا تار تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے ہوئے بھائی نے مجھے گھورا "خیر تو ہے۔۔۔۔۔ یہ کتنی پنی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے؟" میں شہنشاہ سا گیا۔ "تمہارے دسویں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔" میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گزری کے ہندسوں کی مجھ سے جیسے کوئی جنگ سی جا رہی تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوتی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لحوں کے ساتھ ضد سے تاپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گزریوں کے گزارنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور انتہا میں گزر گزرا رہے ہوتے ہیں، اسے تھلگ جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں تاپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش منول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، ٹھکر ہے، اس وقت ماجد اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں سو رہے تھے۔ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوڑوں کی ٹیل کے نیچے بھی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم بھول رہا تھا۔ دھڑکن بے قابو تھی، اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر تحقیر اور تمسخر دیکھا تھا کہ مجھے براہ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہذا جب ناہید اپنا سیاہ و دو چار سر پر جمائے ہوئے آکر بیٹھی، تو جب بھی میری نظریں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈل میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں حریہ تھکائیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ "سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح کرنا سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتے ہیں۔" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کچا کھج بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر ایک دم اپنے دماغ سے مٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعری تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کول ہاتھ صلی پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی کپڑوں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آگئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ۔۔۔۔۔؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی ضرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے ہوتے ہیں، جب نغمہ میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ کھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو جن سے، ہر کسی گناہ کے بوجھ تلے دبے اس ضرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن کا کسی نشے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے قہار کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی ٹھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کتنی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹولے اور میلے سے آئینے کے ایک کٹڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے پنے ٹپ ٹپ میر میں کرجی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس ٹپ میر اپنی چاچا کو دنیا کے سارے آئینے



توڑا لوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے خوب صورت ائمہ مٹے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک ہی ہی بنا دی ہوئی تو اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہر ہی مجھے ماجد نے دھرایا۔ ”ہاں، شہزادے اکٹیا پکڑے، ہماری بھتیجی کے گھر، دو بجی ہم سے ٹھپ ٹھپ کے۔۔۔!“ میں نے ماجد کو ٹیوٹن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آؤ بھری۔ ”ہاں میاں! یہی تو فائدہ ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اس عالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں۔“ پھر ماجد کو پیسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں۔۔۔ یاد آیا۔ یا ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور سننا ہے لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو میں شاید ماجد کو نال دیتا، کیوں کہ ہر نئے کسی نہ کسی کے قدموں میں پھینکنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقصوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوٹن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادل غواست چند طور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی غالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ”مناثر کن“ دستخط کر سکے۔ میں جیسے جیسے جان بھر کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور محن میں بیٹھے تھے گزرا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتانا کچھ ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مد ہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جائیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعرو شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعری زبان یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ بل بل کاٹوں پر کاٹ کر گزارا کرتا، مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے حسن کے نور کی بجلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوٹن پڑھانے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات پلٹ کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، نکلن، چوڑیوں کی کھٹکناہٹ، آواز کا زیر و بم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریں لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی بخروٹلی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ ان لکھوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے پتھر میں، میں خود دن بھر اردو کے رٹے لگا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوٹن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سینما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیا نو پڑ بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سنارہا تھا۔ سفید لباس میں ملیں وہ ہیرو پیا نو بھاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اسی لمحے میرے اندر بھی پیا نو سیکنے اور بچانے کی خواہش، ایک شدید کک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیا نو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیا نو کے پہلو سے بخوبی میرے قریب کھڑی محبت سے میری ڈھن سن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ و جھجکوں اور سیاہی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچھے رکھیں۔ کچھ خواب کھٹے اثر انگیز اور روح تک میں سرایت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک ہمیں اداس اور بے چین رکھتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوٹن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے تو اب نئے میں صرف تین دن ٹیوٹن اور تین دن خود ناہید کی اپنی ڈھرائی کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوٹن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اس ایک کھٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید حسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوئی ہے، جسے عام گفتگو یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سونے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تجلیے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اسی تجلیے میں مقید رہتا۔

اس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور مچا تھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا پیچھے چلائے پیچھا کر رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چست سے نیچے گلی میں بھاٹکا تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ”نہ میاں!۔۔۔ کوئی کسی کی چست پر بو نمی نہیں پاتا۔ ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا۔“ دوسرے صاحب منٹائے۔ ”ہاں بھی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بزدل کی عزت اور غیرت کیا جانتے۔“ پتا چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے وابستگی پر لٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے ان کے چست پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہونے بنا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے انہوں اور بہ نامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور با کردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چر چار رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکا تو میں نے شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اماجی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شراب کی آواز آرہی تھی۔ میں بھی سن گئی لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔ ”بیرہ!۔۔۔ یہاں گھر میں ٹھپا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھناؤنے کروات ہیں اس گلوے کے۔“ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ”جی!۔۔۔؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ ”کیا کیا ہے تم نے؟“ خوب۔۔۔ ابھی بتاتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پہچانا ہوں میں لکھتے۔“ میں نے کاپی نظریں میں ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان اسے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں!۔۔۔ مگر یہ خط تو میں نے۔“ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زکاتے وار چاٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)



ہاشم خدیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا وہم“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پرئی زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز مضمون ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے ان سخت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا چاہی پڑا ہے:

ایڈیٹر: ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل: [sundaymagazine@janggroup.com.pk](mailto:sundaymagazine@janggroup.com.pk)

میں نے اس زوردار تھپہ کی آواز ایسے گونجی، جیسے ہم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجھے گھبراتے گئے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کو دھکا اور اس بات کی خبر ناہید کی ای کو صبح سویرے اس وقت ہوئی، جب دو چھت پر کپڑے ڈالنے گئیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا تیرا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھر والے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کا جڑ میری تحریر سے بھرا ہوا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپہ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے دم دم ہونے لگے، مگر روح پر گئے تھپہ کے داغ پھر عمر بھر مندل نہ ہو پائے۔ بھینڑ کے چھتے ہی اتار اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچے ہوئے اندر گھن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیلگوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ ”اچھا..... تو یہ تھی تمہاری نیوشن..... خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے..... عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لینی تھی۔“ جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک اک طعنہ بھی کسی نازیبا نے کی طرح لگتا ہوا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا بیٹکاٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماچھو کو کیا وہ رکتا ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ بیماری کی ہوجا کسی صلی کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی۔ پروانے کو صبح سے موسم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف چلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے صحنے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دوسروں کے استقامات میں نے پوچھل دل اور اچھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور یہ مشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے تبا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ دو بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی لوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پیڑل ہوٹلوں وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹک رہا تھا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمبے کوپوں لگا، جیسے آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا تو وہ واقعی ناہید ہی تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بیک میں سموسے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہو، اور اگر ناہید نے برا مانا یا اور غصہ کیا تو پھر.....؟؟ ایک اور تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر وہ بارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آنا سامنا ہو پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو ہمیں بھرپور سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگا یا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر حریف کچھ سوچے بنا کیفہ کی طرف قدم بڑھا ہی دیا۔ اندر بہت رش تھا، میں پریشان لگا ہوں سے اسے چاروں طرف کھونچ رہا تھا، اور پھر..... وہ مجھے ایک کیمپن کے پروے کی ادٹ میں چٹکی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھینڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیمپن کے پاس چٹکی کیا۔ ہیرا کچھ دیر پہلے



ہی چائے کے کپ میز پر بچھا کر واپس چلنا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھٹک کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی کھلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر جیسے اس کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کہیں میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم خقل سے ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رقعہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی نل بھر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس چلنا اور کہنے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ "معاف کر دے یا پرہیز..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر..... مگر تو نے بھی بڑا اثر دوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔" میرا سر تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اس رات ماجد کو کوا تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپانے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشنا ہوا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے یہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ "تو کیا وہ خط تم نے ناہید سے ہی کے لیے لکھوایا تھا؟" "ہاں یا! اسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگائی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھو کر اسے دوں گا۔" میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ "مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ تمہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی۔" ماجد نے کھسکا کر قہقہہ لگایا۔ "وہ سب بھی نہیں ناہید کے کہنے ہی پہنچتا تھا، تو نہیں چاہتا یا۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چٹا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی سول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پر تو نے آکر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔" میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی ذہن میں نہ جانے کیا کچھ بول رہا۔ اتنے میں کہنے کا ایک حیرا ہوا اور ماجد سے بولا۔ "آپ کو اندر بلارہی ہیں۔ کہتی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیسے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ "امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔" میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے تو بچ بچا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، تب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ آپ تو اپنی جگہ کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا ہوا رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وچیں کر گیا۔" ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جاتے تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ "دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب بتانے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔" میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بیک وقت کئی شے پھٹنا پھوٹ رہی تھیں اور میں ننگے پاؤں ان کمرچوں پر چلنا ہوا ہاں سے اٹھ آیا۔

پچانچیس، میں نے اُس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاطعلق اور بیگانہ سا ان راستوں پر چل رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی دیرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سو گوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خود فریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے کتنی بار نوتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ محض ماجد کے قصوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن ٹن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر بیکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی تکرار مجھ جیسے پرہیزگاروں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بد صورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینٹین میں اور کالج کی راہداریوں میں مجھے پھر سے اسی تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جملے اور تحاریر بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھٹی سے ہار بار چھٹنا ہوگا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات نورجہان سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب و غریب شخص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ "اے او

ناساز..... تیری بھر سے نہیں سہیلیاں آتی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لکڑی کی روئیاں توڑے گا۔“ ناساز کے باقی دوست بھی ہنس پڑے۔ ناساز نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی راگھ جھاڑی اور ایک بھر پور کش لے کر دھواں فضا میں اڑا دیا۔ ”وہ طفل کیا کریں گے جو گھنٹوں کے بل چلے۔“ پتا چلا کہ گزشتہ تین چار سال سے ناساز جو تھے سال ہی میں الگا ہوا ہے۔ اسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ، کیوں کہ وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرافیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناساز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹپک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ”بات سنو لڑکے.....“ میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ ”سگریٹ پیتے ہو؟“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔ ”پھر کیا خاک چیتے ہو.....“ میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کیشین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک فلیپ اور ماچس لے کر دوبارہ ناساز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی آغوش پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ سلگا کر دو چار بھر پور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ کونٹینر کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے تو میں پلٹ کر جانے لگا۔ ناساز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر راگھ اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پیسے تھے تمہارے پاس؟“ ”ہاں! کرائے کے پیسے تھے، جو آج تمہارے کام آگئے۔“ وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”مجھے ناساز کہتے ہیں۔ میں اپنا تخلص ناشار رکھنا چاہتا تھا، مگر پتا چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکا ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے انکھتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاد“۔ ناساز نے زور سے ”واہ“ کہا۔ ”نام تو بڑا شاعرانہ رکھا ہے پیارے..... زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لیے اور نظر میں اپنا نام سن کر طنز اور تسخر کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ یہ میری اور ناساز کی دوستی کی ابتدا تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھائی نہیں تھی، نہ ہی مجھے خندے پسینے آتے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ناساز سگریٹ کو نہیں، سگریٹ دھیرے دھیرے ناساز کو ہل رہی ہو، نگل رہی ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال ہی بڑا تھا، مگر اپنی باتوں سے کوئی بوجھ بھی روح دکھائی دیتا تھا۔

چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجن کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریرات میں جانے سے حتی الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فائنل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکر کر بیٹھا ہوا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرمادیا، مگرٹ جانے آخری مرحلے پر وہ پسپا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے۔ ناساز دھیرے سے مسکرایا۔ ”تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ٹاپی جاتی۔“ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد.....؟“ ”پہلے بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ”مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی.....؟“ ”کیوں..... تم سے محبت کیوں نہیں کی جاسکتی.....؟“ میں چپ رہا۔ ناساز کچھ گیا اور بات بدل کر بولا۔ ”شاعری پڑھتے ہو.....؟“ ”ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔“ ناساز نے نصیحت کی۔ ”شعرا یاد رکھا کرو، صاحب نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا.....“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”منیر نیازی کو پڑھا کرو..... اور اس کی ایک نظم تو زبانانی یاد کر لو۔“ ہمیشہ دیر کرتا ہوں میں..... ضروری بات کہنی ہو..... کوئی وعدہ نبھانا ہو، اسے آواز دینی ہو..... اسے واپس بلانا ہو..... ہمیشہ دیر کرتا ہوں میں..... کسی کو موت سے پہلے..... کسی غم سے بچانا ہو..... حقیقت اور حقی کچھ اس کو جا کر بتاتا ہو..... ہمیشہ دیر کرتا ہوں میں..... میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رٹا بھی لگا لیا۔ ”بس..... اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرائی ہے۔ میں تمہیں چند اور اثر انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروا دوں گا۔ کیا سمجھے.....؟“ میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعرو شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماجد کو بھی بہت سے شعرا یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلیں کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروا دیں اور پھر جس دن میں نے بزم ادب کے پیرے میں کھڑے ہو کر ”محبت اب نہیں ہوگی..... یہ کچھ دن بعد میں ہوگی..... گزر جائیں گے جب یہ دن..... یہ ان کی یاد میں ہوگی“ سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجاائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کئی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا..... اور مجھے کالج کی بزم ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا سماں ہی نہیں، مگر ایک جھوٹا سونا شاعر پلٹے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکتے لگا۔ ناساز کسی منجھے ہوئے استاد کی طرح میری ”شاعرانہ تربیت“ کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔ ”یہ کیا غالب اور میر کے رٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں..... کبھی کبھی ساحر لدھیالوی کو دہرانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہونا..... میں ”پہلی دوہل کا شاعر ہوں..... پہلی دوہل میری کہانی ہے“ والا..... اور ہاں..... کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔“ میں اور میری تنہائی..... اکثر یہ باتیں کرتے ہیں..... تم ہوتیں تو کیسا ہوتا..... تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں.....“ میں دپے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کر رہا ہے، اس ”ایک“ کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کپڑے کی دکان کے نیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پچا لو پڑا تھا۔ کپڑے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔ ”خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ اگر بڑے کے پرانے گلاب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔“ میں نے اپنی جیب دیکھی، ادھوادی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کپڑے سے کہا۔ ”ایک دن ضرور خریدوں گا.....“ ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھکے سے رک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)





مارے ۹ اور بس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈانس سے اتر آیا۔ گزرتے دوں کے ساتھ میری گھاس سے بھی میری بد صورتی سے سمجھتا کر لی، مگر میں خود بچے اس بے ہمیں اور بے قراروں کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو میں کرتا کہ کوئی تیز و جارحانہ لڑائی نہ ہو اور خود بچے ہاتھوں سے یہ روٹی دس نکال کر اس کے جسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا بیٹے میں جڑے نہ پائے، مگر پھر میرا سدا کا باراں دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطائی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی کہ پھر پھر کی نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر جو صرف میرے لیے ہو میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے ہانپا لے۔ کیا یہ خوش، یہ جتنا اتنی ہی مشکل اور ناچیز تھی کہ میں اس کے، بچے درجہ تک ٹھسے ہی پر ساری زندگی خود کو مدامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دیا یہی ہر نظر خوب راؤں کے لیے کیوں ہی رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے نظروں میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

میں دور بھی میں یوں درستی کی ایک مناسبت راہ واری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سرو پا حیات کی بیخ کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی ٹرکے کی آواز سنائی دی۔ "مسٹر بری روڈ" میں نے زک کر دیکھا، مگر جی ڈی پارٹمنٹ کا ایک بینڈ سم سائز کا حتام پہنے دو، تین گلاس فیور کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جس میں متعدد جولاہم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ "آپ اردو زبان پر مست کسے ہی راویں ناں، میرا نام حتام ہے، یہ یا سدا اور یہ ہماری دوست بنتی۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔" جی فرمائیے "میں نے کہا تو حتام کے بچے لپٹی ہوئی۔" دراصل ہمیں آپ کی وہ چاہیے۔ ہم ٹیکسیٹر کا بچے، پرفارمر کا ناچا بچے ہیں، مگر میں اجازت اسی صورت میں دے کہ اسے کا ایک شو روڈ تھوڑے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے بچے ڈر سے کا ترجمہ کر دیں گے؟ "میں نے ان تینوں کے تجنسس چروں پر نظر ڈالیں۔ "کوشش کروں گا کہ کہ پاؤں۔ ویسے کس ڈر سے کا ترجمہ کرتا ہے؟" وہ تینوں خوش ہو گئے اور با سدا جلدی سے بولا "OTHELO" "ٹھیک ہے آپ لوگ تین چاروں کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتا دوں گا۔" ان تینوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ "گریٹ" اور جاتے وقت بڑے بڑے جوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ بنتی سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لڑائی پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرامہ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حتام گروپ کی تلاش میں لگا تو پتا چلا کہ سار گروپ آئیوریج میں ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہے، میں پچ چاپ ہال میں داخل ہو کر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں ملانی کی داخل روشنی بجلی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے سٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھ رہے تھے، مگر لپٹی کی اداکاری، لگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے اور کر رہی تھی اور سار گروپ ٹھوڑی ٹھوڑی ریہر بعد سے خوب حم کر رہی تھی دے رہا تھا غشی ایک ننھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں بیروں کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس سے کمر ہٹا دیا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تائیاں بچانے پر مجبور ہو گیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور دور سے چلائے۔ "رے" تم ہو یہی راو آؤ، سٹیج پر جاؤ۔" حتام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا مدد ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے اپنی کواں کی اداکاری کی راوی تو وہ صبر جھٹک کر ہوئی۔ "نہیں،" بھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پا رہی۔ میرا خیال ہے کہ جب بیروں کی موت ہو تو اس وقت کچھ شعاریا کوئی غم گیس لقمہ ضرور اور پیپ ہولی چاہیے۔ تب ہم یقیناً پورے ہال کو رانے پر مجبور کر دیں گے۔" مگر جی ڈی پارٹمنٹ کے باقی کچھ طلبہ، جو اس ڈر سے میں صدمے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب، اونچے گھ انوں کے چشم و چراغ تھے۔ اس کے قہقہے باس، ہکون اور پر لہو کی مہک ہاتھوں میں پسی جیتی گھڑیاں، برصطانی اور ایک جانب بے پروائی سے پھینکے گئے ہتھکے پیکر اور جھوٹے ٹیکس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ ساں پر لی گھسی ہوں چٹوں سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل مادہ کی بھی پٹی ایک حاص چکا چونہ ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور عربت سات پردوں میں بھی چھپی ہو تو، شناخت بھپانے نہیں چھچھتی، ننھی کی کچھ، مگر بڑی میدیم سہیبوں سے اسے ٹھنسی مار کر کچھ کہا اور سب دور سے جس پر اس ننھی سے مجھ سے نظر پچ کر اس سب کو انگریزی میں ڈٹا اور بچے روئے پر قابو پاے کی ہدایت کی۔ میں نے ننھی کو بتایا کہ میں نے دھیمو کا ترجمہ کر لیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریہرسل شروع کر سکتے ہیں۔ حتام نے مجھے بھی ریہرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تھک چکی چانچ بھی کر سکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی تو باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں گھلی چھت پر تاروں کی اڑھنی کے نیچے بیٹا ڈر سے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے ننھی کی بات یاد آئی کہ گزرتی کی موت کے پس منظر میں کوئی درد انگیز ٹی لقمہ ہو تو تاثر دہا ہوا جائے گا۔ "اوتھیلو" کے اختتام پر بیروں کی رقیب کی لگائی ہوئی شک کی آگ میں تھلس کر خود اپنے ہاتھوں سے بیروں کو گلا دھا کر مار دینا ہے، درہل بھری نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو نگل جاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا مرث گھڑی بھر میں نفرت کے ٹکڑے رہیں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سیکے کے دو رخ ہیں۔ جذبات کے بازو میں دووں کا مول یک ساں رہتا ہے، مگر جب کسی اسان کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے وہ بہت چیزیں دھکیلیں، یادوں اور ایک دوسرے سے جوئے معمولات سے بھی کیوں نفرت کر لے لگتا ہے۔ جس راتے پر کبھی دو بیار واسے ایک ساتھ چلے تھے، وہ رستہ کیوں علاقہ ممنوع ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بچہ، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑے وہ چائے وال، جس کے ایک کپ میں دونوں کے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، جہاں نوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، مسلوں میں رکھا وہ سوکا گلاب، پر لہو کی حافی شیشی، ہنگی ہوئی وہ آرمی مپ، سنک، ایک کھویا ہو کاف لٹک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پچے وہ پرانا بس، سٹاپ، ڈیڑھ فہر کی کھنار اسی اس درخت کے نیچے کھڑا وہ بھوں پانی والا بعد ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں دھلتی اس کڑا وہٹ سے کیا تعلق؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، ہاتھوں اور جھکوں کو کیوں شامل کر بیٹے ہیں۔ اسان کتنا غلام ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔



ڈر سے وہ لے دیا ہال کچا کچا بھر تھا ساری ہون درنی اٹھیا کو اور دوسری جیسے بولتے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور ہیروں کی تیزی سانس لگنے سے پہلے ہی منظر میں میری نظم کے ہوں گونج اٹھتے ہیں۔ سو، تھوڑی دفاہم گرچہ پور یقین ہے مگر بدنی زقوں کے در کا کچھ بھروسہ نہیں۔ سو اگر کبھی یہاں تک نہیں مجھ سے نفرت ہو جائے اور میری روح کی کوئل پھٹیں۔ تمہیں کسی جوں کے، نہ تو ٹھیکے لگیں، تو جیتے دلوں کو یاد رکھنا کہ یادوں کا جزو، رزم کو بھرتے نہیں دیتا۔ ہاں اگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو ہم نے جنھوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں اور کسی کم نصیب کی یہ راہی سے باتوں کا کیا پیدا دیتا؟ ذرا سے کے منظر میں اوجھو ہیروں کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروں (ڈیسنڈی مونا) سو رہی ہے۔ اوجھو اپنی محبوب کو جگانا ہے اور مرد بچے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کرے اوجھو کی محبوب کی آنکھوں میں آسو بھرتے ہیں وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ سے آج کی رات چھینے دے، پھر چاہے تو میں بارڈا سے، مگر اوجھو کی آنکھوں پر شک کے کاغذے ناگ کسی کر پٹی پاندھ چکے ہیں، اور کہتا ہے "اب بہت دیر ہو چکی۔"

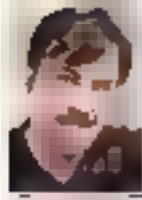
ہاں منظر میں نظم کے ہوں دور لپ ہو رہے تھے۔ اور سٹو، میرے محبوب کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے کہ ایک تو روح کو اٹھاتے ہیں اور کسی کے مقدر کے مدھیروں سے ان رنگوں کا کیا پیدا دیتا؟ ڈیسنڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اوجھو کو کھینچ پکڑوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوجھو کے بھاری ہاتھوں کی انگلیوں اس کی نازک شہرگ کو دبا کر شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس لگنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور میسٹر کی چادر پیچ کر جاتی ہے۔ اسے میری دفا کے مالک۔ کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے کہ نظارے تو قدرت کا خشن ہوتے ہیں اور کسی حرام نصیب کی بد صورت یادوں سے ان نظاروں کا کیا پیدا دیتا؟ اوجھو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوب کا دم ٹھٹھ رہا ہے اور وہ اس پان کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جاں دے رہی ہے۔ اوجھو کی آنکھیں وحشت سے باہر کو اٹل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جاں سے پیاری ڈیسنڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوب کی انگلیوں کے ناخن اوجھو کے ہاروں کی رنگوں میں پوست ہوئے جا رہے ہیں لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ دور سے کاہتا ہے۔ میرے ہم نفس..... میری جان..... اس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت کرنا کہ میری روح کی سیاہی سے ہی یہ چارہ اندھیر ہے۔ اوجھو کی محبوب، اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری پگلی بنتی ہے اور اس کی روح قفسِ حصری سے پراں کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کی بے جان کھنکھ آنکھیں اپنے عیارے اوجھو کو دیکھ رہی ہیں لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اوجھو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا اور ہاں ہے اور سٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈر باختم ہونے کے بعد چند لمحوں تو سارے ہال میں ساٹا سا چھایا رہا اور پھر تابیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ اس۔ لکھی راتوں رات سارے شہر کی ہون اور شیر میں مقبول ہو چکی تھی۔ ذرا سے کی کام دینی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جاتا چاہتا تھا، مگر اس سے میری ایک ہمسن سی اور مجبور مجھے اس شام وہاں چانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ، جس کے درمیان پریوں کے گھر جیسی ایک شاں دار عریض کھڑی تھی۔ کچھلی جاں سوئٹنگ پر تھا اور پارٹی کا بدو بست وچن کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اہتمام بھی تھا۔ بستی کہیں سے پٹی ماں کو کھینچتی ہوئی سے آئی اور ان سے میر تعارف کر دیا۔ قیمتی سازی میں ملیوں، ہیر سے جو ہر ت سے مدلی پھندی اس عورت نے مجھے حور سے دیکھا اور ہوت سیکڑ کر کہا۔ "خوب تو یہ ہے پری راو؟" مٹر سنگ۔ "میر جی چاہا لکھی کے کان میں دیر سے سے کہوں کہ یہ سے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں عرب کو اس کی حیثیت یاد دلانی جاتی ہے، پھر مجھے حور اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ اسنے میں میرے عجب سے ایک جھگی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "اعادہ تو یہ ہیں مسز پری راو جن کی شاعری ذرا سے میں ڈب کی گئی تھی، بھئی وہ لکھی، کیا داکار کی کی تھی تم سے؟" میں نے پت کر رکھا۔ ایک پتی عمر کا وہ سا شخص آہستہ آہستہ ڈنگلاتے قدموں سے ہماری جاں چلا رہا تھا۔ بستی نے تعارف کر دیا کہ "یہ سینہ عابد ہیں، ماں کے خادمہ لی دوست۔" وہ شخص لکھی سے بہت بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نقشے کا کار تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑ ہو گیا تاکہ کسی کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سینہ عابد کھانا لے کر پٹا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ "اور جناب! کیا معروضات ہیں آج کل، دراصل میں خواہی چھوٹا سا ناٹا عروں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مدحوس کی پیاس بجھائے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھند ہی جاں نہیں چھوڑتا۔" سینہ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار عریں بھی مجھے سنیں، جس میں اس کے میں سے شکر کیا کہ اس کی کتاب بھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سینہ عابد اپنی دھن میں تگن بولے جا رہا تھا۔ "نئی تنہا شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی ٹوک پک سوارہ سے بھی ایسا یاد دہانہ لکھی کے معیار پر پوری اتر جائے۔" میں نے حیرت سے سینہ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سینہ عابد سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "اور اس کام کے لیے میں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں، نئی تاریخی جی کہ تم کو خوش پڑھا کر پتی چھائی کا خرچہ پور کرتے ہو۔" میں نے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ "صاف کچھ گایا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز کا کوئی نہیں ہوتی۔" عابد ظفر یہ انداز میں مسکرایا۔ "لفظ..... آج کل سب ہکا بکا ہے اور جس محفل میں آج آتم کھڑے ہو، ماں اُحراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ محض ایک شام بعد سے کے کام آتے ہیں۔ ورنہ سنڈے دل سے سوچ بیٹا۔ میں نے بڑا سے بڑا سے قلم کاروں کے مسودے رومی کے بھاؤ پکٹے دیکھے ہیں۔" میں لکھی سے اجازت لے کر وہاں چلا آیا۔ جب ماں کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے، مدر کا کھانا یا کیوں چاگ جاتا ہے؟ کیا یہ بھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لکھی تو ن جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک حاسم احترام دیکھا تھا۔ میر بھوڑا دل ایک بار پھر ادا ہو چکے کے بھا سے اچھوڑ رہا تھا۔

اگلے دن لکھی نے مجھے پونی درنی میں پنپ در دس دیکھ تو اسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اس کی ماں کے سلوک سے اس بدداشت ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے سے تسلی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سن کر اس کی سیاہ جھیلی آنکھوں میں ادا کی تر آئی۔ مجبور اس کا وہ بعد نے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مٹاں دہرائی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے در جس پھر سی فلمیں، کچھ کہ خود کو پسند ہی، یعنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ میں ایک کی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا ناٹا نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر سی پچھیشن میں عرب بڑا کا ہیروں کے سے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر وہ دور سے غص پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لکھی نے چانک یونی درنی تاہم کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چونکہ درے لکھی کے نام پر مجھے گھر کے لاس تک پہنچا دیا۔ لاس میں لگے سنگ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس بنی کی ماں کو بیٹھے، کچھ کر میرے قدم کھینچے۔ دوسرا جھٹکا مجھے بنی کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے۔ سنگ مرمر کو دیکھ کر لگا۔ اس نے حور سے میری طرف دیکھا اور سنگ مرمر کی راگ جھاڑ کر بولی۔ "بنی سے ملنے آئے ہو؟" میں نے شہنا کر جواب دیا۔ "بنی کی ماں سے میری آنکھوں میں جھانکا" محبت کرتے ہو، میری بنی سے؟ "مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے پیچے سے میں کھینچی ہو بنی کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)



— پاشم نكدم

ہاشم ندیم کو جواں نسل کے پسندیدہ، فلک کے معروف و مشہور ڈراما رائٹر، ناول نگار تین سیدنا "حیدر" محمد اور بچپن کا سہیل سے ہیں اللہ تعالیٰ پر ان حاصل کی ہو سب کچھ یہ میں شاید ایک ایک نامی عہدہ کو بھی وقت سے پسندیدہ "سید" اور "حیدر" حاصل ہوا۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش پر مثال سے مودحی کار کا رقبہ ہے۔ یہ عہدہ شرف میں عہدہ نامی یہ جس وقت ان عہدہ کی ترقی کا سبب سے بھی قدم رکھ رہے ہیں۔

پن۔ میب بھوتہ حسن۔ و قد رے شعلہ منور پرتی بہت سہ دل خیرے یہ جیسا یہ شخص کی گفتا ہے جسے اک کم صورتی کے میب سے سب سے کلام پسند و رچ سست دیا۔ سست بہ صورت دوسرے بد وقت کیوں کا سامنا کرنا چاہا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ اگر ادا ہوا ہی پڑا ہے

یہ ہے۔ مدد سے میٹنگز میں، اور عامہ گفتگو میں، آپ کی چیزیں بیکر اور پڑیں۔ ٹی میل

[sundaymagazine@anggroup.com.pk](mailto:sundaymagazine@anggroup.com.pk)

لٹنی کی ماں کی بات سن کر چند لمحوں کو تو میں گنگ سارا گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "جواب دو کیا میں جلد کبھری ہوں تمہارا سے چہرہ پر صاف لکھا ہے کہ تم لٹنی سے محبت کرتے ہو۔" میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حاست پر نرس آگیا۔ "نہر چلے جاؤ، وہ رات تک روم میں ہوگی۔" میں تیز نیز قدم اٹھانا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ نئی ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب اداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک جھکی سی مسکراہٹ اس کے ہون پر پھیل گئی۔ "بڑی راد کیسے ہو؟" میں نے ہنسنے ہی سوال کیا؟ "آپ تنے دس سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔" لٹنی نے میری طرف دیکھے سے گر کر کہا۔ "ہاں۔ میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ تنے میری شادی طے کر دی ہے۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟" "سینٹھ عابد کے ساتھ۔ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔" یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔ "سینٹھ عابد سے نکرے آپ اور وہ میرا مطلب ہے، آپ کے بے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔" لٹنی کی ٹپکلیں مہم ہونے لگیں۔ "بات میرے انتخاب کی نہیں ہے بدی راؤ۔ اونچی بون کی ہے، جو بھی میرے لیے اونچی بون لگائے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی، میری بدی راؤ کی میں سے اونچی بون کسی اور سے نہیں دی۔ لہذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔" مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ "بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لٹنی کی شریف گھراؤں کی لڑکیاں تو رخصت ہوتی ہیں عورت کے ساتھ۔" لٹنی کی آنکھ سے ایک "نسو پٹکا" تو پھر بھی سمجھ دو کہ میں بھی، چہرے سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بویاں لگتی ہیں۔ رخصتی نہیں ہوتی۔" مجھے سب کچھ گھومنا سوا محسوس ہو۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" "ٹھیک کبھری ہوں۔" سب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی بدی راؤ۔ پندرہ دن کے بعد میری دیا دکھاوے کے لیے ودرم بھی اور ہو جائے گی، جسے یہاں رخصتی کہتے ہیں۔" لٹنی کی آنکھیں اب باقاعدہ برست لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عادی شان گھر میں رہن کس اور میری یہ اعلیٰ تعلیم۔ یہ سب دکھاوا ہے بدی راؤ۔ تماری یہ شاں و شوکت اس ہی سینٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بار رخصت کہا کرتے تھے، اب وہ بار رخصتی حاس علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پچھل کر شہر اس کی ان اونچی اور اعلیٰ ستیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں پتا نہیں، وہ میری نگ ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا حسان ہے کہ اس نے مجھے پٹی تعلیم کا شوق پور کرنے دیا شاید یہ بھی بار رخصت بولی بڑھانے کا ایک کارٹڈ ٹیڈ ہوگا۔" لٹنی بولتے ہوئے تھے حاشوش ہو گئی۔ میرے پاس بھی سب کہے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، ہوا وہی کے سے قدم اٹھا۔ بے کہ عقب سے لٹنی کی "ڈان" تھی۔ میں نے یہ سب کچھ جنہیں اس لیے بتایا ہے بدی راؤ کہ تم نیک بچے دوست ہو۔" میں نے پٹ کر سر تھکائے سیاہ پاس میں بیویں، ذہنی سرمئی شام چھٹی بقی کے وجود کو آخری بار اپنی ذہنی آنکھوں کے "بچنے میں سمویا۔ اس کے گلابی عارض "مسووں سے ڈھل سے گئے تھے۔" لٹنی جی۔ کاش امیرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر رکھ دیتا۔ مگر آپ تو چاہتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو اور کرے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو کس کسی اور کے خریدے گئے بیابان پر بیٹھ کر خدائی کا گانا ہی گا سکتا ہے۔" لٹنی کے ہونٹوں پر میری بات سن کر ڈراویر کے لیے ایک ہلکی سی مسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں بے پٹ آہ۔ لاں میں اوارے کے قریب کڑی ڈالنے لٹنی کی ماں ابھی تک جنہی فن پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے دایک جاتا رہ کچھ کڑوں کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری ڈورے جیسے میرے قدم ٹکڑے۔ "نسو لڑکے امیری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بڑی عورت ہوں مگر نہیں ایک بچے کی بات تمہاری ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رُتبہ اور عہدہ پر دیکھتے ہیں۔ اہل بیت مرد کے ہر عیب، ہر خاں پر پردہ کرتی ہیں۔" سینٹھ عابد کی میں کچھ پاتا جا ہوا تو میری آنکھیں ہمیشہ پاور کھنا۔

چند روزوں بعد شہر کے تمام بڑے اجاروں میں ملک کے معروف صنعت کار، سینکھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے یہ ساری سے اجارے پوئی ورش کی، بھیری کی میر پر نیا دیئے ٹھیک ہی کہا تھا اپنی کی ماں سے، سارا انھیں پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچو، لفظ داخل حیات اور ادب میں، سب کسی کام کے نہیں۔ دھڑی پاس ہو تو پھر سارے میدان ہی اپنا ہے۔ میں ان کی حیات میں گھر گھر آیا تو دوڑوں سے بھائی اور بھائیوں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے "ہاں میاں" اور کتنی چنے کی تھپڑوں یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ نہ رہا بھی ہے تمہیں۔ بھائی تمہاری اس شام کی دو ٹوٹنوں میں گڑے نہیں ہوتا۔ "دوسرے بھائی بڑے۔" میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کسٹ کلنگ لگ جاتا ہے۔ وہی کلنگ ہوگی اور وہی مینے پھر کے پانچ سات ہزار۔ "بھائی بڑے مشہور یا میری ماں تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑو۔ جتنی تو یہ ہے کہ بھائی ہمارے اپنے بچوں کے خرچے سے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں جو بچے مرے سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عمر کے بچے کے سب لڑکے لو کر یوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے



ہیں۔ "میرے یہاں کے یہ جسے کچھ غنے کہیں تھے، بٹے میں ایک آدھار یہ قطعہ درمیریل ضرور چل تھا، مگر تھ۔ نہ جانے کیوں میر دل پیسے ہی تھابھر ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہی سے رکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکا کر سب کے منہ بند کر دوں۔ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جاہل کتھے، نوکری کے لیے برسوں جوتہاں چلتا تے پھرتے ہیں۔ اور پھر انشورویہ، جو کسی بھی نوکری کا رومی خود ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا، کبھی کبھی شرط اور مل جاتا ہے درمیری شخصیت۔ مجھے تو شاید کوئی بڑی عرصہ یا دفتر انشورویہ کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی ہنر بھی تو نہیں تھا مجھے یاد آیا کہ مجھے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویڈیو گیم پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک مقررہ رقم گھر والوں کے ہاتھ پر کر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فائل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، اس کی تیاری میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جا سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر بیٹوں کا۔ شوکی کے گھرانے کا پانا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گھرانے کے گیت پر پہنچ کر سامنے کا دروازہ کھٹکے سے شوکی کے در سے میں پوچھا، تو لڑکا شوکی کو بتا دیا۔ "خیر چل گیا۔ میں نے اس پاس نظر دوڑائی۔ گھرانے کے گیت کے اوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا "استاد مستانہ ویڈیو گیم گھرانے" لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی سو رہا۔ اور مجھے گیت پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا "ارے بری راو بھائی آپ، یہاں سب حیرتو ہے؟" میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ "ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گھرانے میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔" شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ، یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھ لکھے ہو پڑی بھائی۔" میں نے شوکی کو نوٹے پھولے لفظوں میں سمجھا دیا کہ کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجھیری بن چکی ہے۔ سنے میں گرتے شکار میں بیٹوں اور پر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موسیے کا بیٹھو سکانے ایک شخص ہمارے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چنے سے ہاں ایک جاب بیٹھے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پاپ کی لاف اور پتلی طرب اور موچھیں، دونوں جاب سے "دپر بھئی تمھیں اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے حیرت سے دیکھا اور دھیرے سے گنگنا تے ہوئے بولا "وہ تے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے۔۔۔ میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟" شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ "یہ نہی راو بھائی ہیں استاد جی، میرے بھلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔" استاد مستانہ پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درویش آنے والی بحث کو بھٹک کر اسے کی غص سے بولنے میں ڈھل کی۔ مگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔" استاد مستانہ میری بات سن کر ایک درخندہ ہو گیا۔ "معاذ کرنا میاں! شاید تم زبان لگے۔ میرا مقصد تمہارا اس رکھنا ہرگز نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو؟" میرے بولنے سے پہلے شوکی بول تھا "بری راو بھائی یولی درشی میں پڑھتے ہیں استاد۔" استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "لگتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟" "ہاں، ایسا ہی کچھ نیچے۔" مستانہ استاد نے فیصلہ کرے میں دیر نہیں نکائی، "ٹھیک ہے میاں! کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟" یولی خالی ٹھہریں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔" میں نے آستینیں چڑھا دیں۔ "آج سے استاد۔" رات دیر گئے، میں گھر میں چھٹی تو حسب معمول میرا انتظار کیے بنا سب سو چکے تھے۔ میں نے اپنی رمدی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے بڑھ سے میں پڑی پنچکی پر رکھ دیئے اور صبح سویرے منہ اندھیرے پھر سے اٹھ کر گھیرن چلا گیا۔ استاد مستانہ اپنے حزانے کا ایک نگہ ہی بدو تھا۔ ظہور میں کام کرنے کا شوق "اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر کو بھیجا، یا تھا، لیکن قسمت نے ادا کار کے بجائے مسزئی بنا ڈالا مگر اس کے اندر کائن کار بھی تک دندہ تھا درمستانہ بھی تک برنی ظلم کا پسدا شہر، پیسے دس دیکھنے کا قائل تھا اور پھر ظلم شہر سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تہرے جاری رہتے۔" کیا حاکم ٹیکٹک کی بیروٹے، ہاں دن سے پھر بھی کچھ رنگ جمایا۔ "میاں! موسیقی کا تو بیز و غرق ہی کر رہا ہے، اس نے لڑکوں سے، اور شاعری بھی کیا ہے ہودہ اور نکو اس ہو گئی ہے، وفادارے کا باپ، میں غلام کا بیٹا، یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو تب ہو کرتی تھی۔ چاہئے آپ کہاں جا میں گے، یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی۔" تیرے میرے سینے ب ایک رنگ ہیں عجیب و غریب اس سے یہ کہاں شروع، کہاں ختم وادہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔" استاد مستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد چپ چاپ اس کے تہرے سننے رہتے۔ مجھے استاد نے ویڈیو گیم پائٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل لنگھو دیا "دیکھو میاں! یہ جو گیم کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھوس کلیاں درخشاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دس ہی میں تمہارے لباس میں ہر رات مجھے نئے شکاف لگ رہے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے گھنے حصوں پر انچاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ و کر دیر گی۔ شروع شروع میں کافی جھن بھی ہوگی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ گم تمہاری دوست میں جائے گی اور تمھیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان ٹکڑوں سے جتنی جلدی شنائی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے چنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔ اب میں اس کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے چل کر رکھ ہو چکے ہوں، اس کا بھلا یہ بھڑکتی گم کیا بگاڑے گی؟" اور پھر ملن کے لیے احساس دندہ ہوئے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھ جیسے بے حسوب کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھلجھڑی۔

یولی درشی کا فائل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے دی والا۔ حالانکہ اب مجھے ڈگری پسنے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یولی درشی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو کٹھ کر کے ایک خاص سرگرمی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگو لیا اور ایک دو گھرانے میں بیٹھا ہی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ کر اس پر ایک طرازی نظر ڈالنے ہی اس کی آنکھیں ٹھٹھل گئیں۔ "ارے وادیاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ بھی کہاں ہے، بتاؤ کیوں نہیں پہنچے؟" میں نظریں چڑ گیا۔ "اس میں تائے نائی کیا تھا بھائی؟" "کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع اور دوسرے سے بڑھ کر، استاد نے وہیں ہا ہر مصرعوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈھونڈ اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔

میں بہت دیر سے ہوئے کے ایک بڑے چٹری نما کتے کو کالے کی تک دو دو میں ابھی تھا مگر اس دن اس لگ رہا تھا جیسے شعلے کو لگی تھی۔ کوئی چہرہ ہو گیا ہے۔ جب اس کا وقت ہوا تو ہر چیز اپنا اثر نکھودیتی ہے۔ شمع آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری میں فون و کائنات کی حاصل سعی کرتے دیکھا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ تپش تمہارے پنے اندر ہے، جو ہر میں تمہیں تھماتی رہتی ہے۔ پری راویاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو، آخر کسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔“ میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”پیارا“ مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر حاجی کا علاج صرف پیسا ہے استاد، اور مجھے روٹی میں بہت سارا پیسا لگتا ہے۔“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”پر اس بار کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دس رات محنت کرو، تب بھی مہینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں چند روپے ہوں گے۔“ استاد نے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گھنٹہ نہیں، یہ پورے شہر حریانا نظر لگ جو بے دے جائے گی۔“ میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ”تو پھر میں کیا کروں“ مجھے بہت پیسا لگتا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ تیار یہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر ذراع، ہر عیب ٹھپ جائے۔“ ”اگر تم پیسا کا ناچا جتے ہو تو دینی چلے جاؤ، وہاں اس ہسٹری بہت مانگ ہے۔“ اگر قسمت سے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کمائی ہو گے۔ کم از کم یہ گریج تو کھوں ہی سکو گے۔“ میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گھنٹہ نہیں، یہ پورے شہر حریانا چاہتا ہوں۔“ استاد ”کیا تم مجھے دینی بھجوا سکتے ہو کسی طرح؟“ ”دینی چاہنا آسان نہیں ہے میاں۔ دیر، ٹکٹ اور قدم جو۔۔۔ کے لیے تم چار رو کے قیام پر چار پانچ، کھانا پینا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر تمہاری قسمت کہ تمہیں لیے عرصے کے لیے کوئی ٹھکانہ ملتا ہے کہ نہیں۔“ اگلے چار ہفتے میں یہی سوچنا رہا کہ آخر ہمارے مقدور کا ہر فیصد کاغذ کے ان چند ٹکڑوں ہی سے کیوں گزارنا ہے، لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈنے ہوئے میں کسی کسی سوچ میں گم تھا کہ چانک میری نظر کالج اور یونیورسٹی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا محبوب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بار میں تھے۔ در میری کتاب کی پر رانی میں شہر کے دانش ور میں مسند کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جھگڑے میں مردہ جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں بجھنے لگیں، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوئیے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضا جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں تب یہ سوتا تھا۔ اور اس کی رونمائی کی طرح ذور میں کسی دوری دیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوئیے اور دھڑکنے کی باتوں جیسی تھی۔ گلے درد میں عابد گروپ آف کے گیت پر کھڑ تھا۔ پہلے تو چونک کر دیر نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی۔ وہ ایک ہار استیلا لیے پر جا کر سے اندر بھجوا دے، ”اگر انکار ہوا تو میں گیت ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے ہر بتایا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سینٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑ تھا۔ سینٹھ عابد نے رگڑ کا ایک لمبا سا کٹن بٹا اور طنز یہ انداز میں بولا۔ ”کیوں، میں نے کہا تھا تال، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، اس ٹھیک قیمت لگانے وال ہونا چاہیے، تو یوں، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔“ میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے دینی کالکٹ اور ویسے کا خرچہ چاہیے۔“ ”گروپ دے سکیں تو۔“ سینٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے تو لا کر پھر ورق گردان کی۔ ”ٹھیک ہے شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دوسو روپے کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔“ میں نے اس کھاڑیے کو غور سے دیکھا۔ ”آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور سناپ لکھوائیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔“ سینٹھ عابد کے ہونٹوں پر جی طنز یہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ”واپس لوٹا بھی سکو گے یا دینی جا کر غائب ہو جاؤ گے۔“ ”چلو ٹھیک ہے۔“ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ استاد پر استحقاق دھنکا کر لے گا۔ تمہارے دینی کالکٹ اور ویسے میرے دے رہا۔“ میں واپس کے لیے پٹ کر دوڑ رہے تھک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوہرہ سنائی دی۔ ”لکھی اب بھی کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تحریب کرتی ہے۔ مجھے مید سے تم سے اس رجسٹر میں لکھی شاعری سے پس سنائی ہوگی۔“ میں نے دو بار سے کاپیڈل تمہارا ”آپ بے فکر ہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔“ اور دوڑ رہے کھوں کر ہار ٹھک تیا۔

مستانہ استاد صاحب معمول پنا چھوٹا سا ریڈیو کالوں سے لگائے کھڑ تھا اور عام گیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ”آؤ میاں آؤ کہیں تمہارے دس بھی تو اپنے استاد سے بھر نہیں گیا۔“ آج کل گریج میں بھی دس نہیں لگ رہا تھا۔ اناٹہ پڑنا نئے کرے۔ لگے ہوئے میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ ”استاد! میرے دینی جانے کا بدوہست کر دو ٹکٹ اور ویسے لگوا لیا ہے میں نے۔“ وہاں تمہاری کوئی جاں پہچاں ہے تو بتاؤ۔“ استاد کے ہاتھ سے ریڈیو بچے کر گیا، اس نے پک کر مجھے جیسے سے لٹکایا۔ ”واو، خوش کر دیا پیارے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے۔“ کب جانا ہے؟ میرا دور کا ایک ہر خوردہ رہتا ہے، وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں اکیلا ہے کئی سال سے۔“ ”نام ہے اس کا۔“

اگلے تین چار ہفتے میں گز رہے، جیسے چار پہلی گز رہے ہوں۔ بھائی بھائیوں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دس بھی پہنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سالانہ سہ ماہی رپورٹ پر کھڑ تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاڑ سے تو کیا، ٹرین سے بھی کوئی سہ ماہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے دو تمام حماقتیں سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوئی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاڑ سے دینی انرپورٹ پر لینڈ کیا در میں گھنٹہ بھر بعد پابراٹھ، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے ریلی نہیں نظر نہیں آیا۔ انرپورٹ سے باہر چلے کا سوچی ہی رہا تھا کہ اچانک کسی سے میرے کاغذ پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پڑنا۔ ”اے والا! شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔“ جھلی دیر سے پوچھنے آئے ہو، چائے ہو، اس کی سرائیا ہے۔“

جہاڑ ہے!





— ہاشم ندیم

ہاشم ندیم اور جوان نسل کے پسندیدہ، شنگ کے معروف و مشہور ڈراما ساز، ناول نگار۔ اس کے باہر حد درجہ محبت اور "بچوں کا بھائی" میں لائق پر ان حاصل کی ہوئی۔ ہندوستان میں شائع ہونے والے ناول "عند سدا" کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے "محسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں "عبداللہ نانی تک ہیں" ان کی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

پندرہ ایف جی ہوتے جہاز اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت کم رقی تحریر ہے۔ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے جسے ایک کم صورتی کے عجب کے سبب، اس ظاہر پسندیدہ و پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رویوں و بدیہیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا "مست محو" کا۔ سارا پانا ہی پرانا ہے۔

یاد: سڈے میگزین، دو نامہ جنگ شہر میگزین، جہاز سب "تین چند میگزین"۔ اپنی نئی نسل

e@janggroup.com pksundaymagazin

اس شخص کی بات میں کچھ نہیں لگتی رہ گیا۔ دیر میں اس کی گرفتار ہونے والے پھر مشکل سی سے سلاحوں کے پار آتے ہیں۔ سینٹ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے، اس سے ہمیشہ کے لیے میر بند دوست کرے کی عمر سے مجھے جلی دیر ہی لگو کر دیا جو؟ میں نے اس کی "تکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ دیکھی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بد صورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، بد صورت کچھ لگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں بنا دیر لگا پاسپورٹ سینٹ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا تو اس سے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا: "نئی تہار دی شہری کی عاشق ہے۔ بچ پوچھو تو گھر میں نے تمہیں دیکھ کر رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کر دیتا۔" اب میں اسے کیا بتاتا کر رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر سہرا سب سے عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا اظہار کر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص دور سے پس چلا۔ "اوپر اتم تو مسجد ہی ہو گئے۔ مجھے پچھانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا بھائی۔" میں نے چونک کر فوراً اسے دور ہار دیکھا۔ استاد کے بتانے ہوئے جیسے سے تو ایک سرخلف تھا وہ رفیق میری مجلس سمجھ گیا۔ "ارے یار۔ استاد سے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں لیکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، راغرا اور نا کارو سا منہ، سوراخاں کا۔ مگر یہ وہی سے پیارے۔ مجھے، چھوٹی کی کا پٹ دیتا ہے۔ اب مجھ ہی کو رکھ لو۔" رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھٹی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ دو واقعی بہت عجیب لگتی تھیں۔ عربی لباس، دو پانچ، بھرا ہوا جسم اور کھٹی رنگت، کون کہہ سکتا تھا یہ وہی پرانی لیکا ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دہلی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے امر ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ "بہت چھا استقبال کیا تم نے، جہاں ہی نکال کر رکھ دی میری۔" وہ دور سے ہنس۔ "معاف کرنا یاد آتی ہے اپنی پرانی عادت ہے۔ ویسے تم امر پورٹ کے اس کوے میں جس طرح سے ڈارے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم طیر کا توئی طریقے سے دہلی آئے ہو۔" ہم دونوں گیٹ نمبر 7 کے سامنے والے بڑے ستوں کے پاس کھڑے تھے۔ دہلی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ بلی جگ ملنے کے لیے ملے ہوئی تھی۔ امر پورٹ پر ایک۔ ختم ہوئے والی بھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد و عورت کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان حالی منزل کی طرف رواں تھا۔ مجھے ایک عجیب سا حساس ہوا، خود کو گم کر دینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا دیوارے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا جھوم بھی خود کو کھودے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے متبع کرے کے باوجود میرا ساں اٹھ کر رپورٹ سے ہار کھل گیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تیس چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف نصیحتیں کر رہا تھا۔ "یہاں کے عرب بڑے معرور اور جڈ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا جہ ہے۔ اس لیے ان کے منہ تلکے سے پرہیز کرنا، اور نہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تنبیہ کو خطا اور سمجھیں گے اور گلے جہاز میں بٹھا کر واپس پاکستان روانہ کر دیں گے۔ مجھے بھی ایک ٹھہر ہوگی، ان کے ناخن لے اٹھاتے اور ان کا جہیزداشت کرتے۔ گاں ان کی رہاں پڑتے دیر نہیں لگتی، اور پنے علاوہ دوسری کبھی، تو اہم کو یہ پناہ نام تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم خود رو طبقہ لوگوں کو تو برہنہ اس کا عدم بن کر ہی گزر کرنا پڑتا ہے۔ لہذا دھار ہمیشہ غنڈا رکھنا۔"

رفیق نے جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں سب اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ہلکی سی نظر میں یہ حساس ہوا تھا کہ جیسے چند بد آؤں سے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر کھیں تھامے کے لیے اونچی دیواروں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میدان بچا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہو جانے لگی تو وہاں پہے خیموں سمیت یہ نئی شہر بھی اکھڑ کر پڑنے لگی۔ جیسے ساحل پر کھیلنے والے بچے دن بھر کی ریت سے گھر دہے بنا کر انہیں شکل کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپس کے لیے آواز لگاتی ہیں تو جاتے جاتے بیروں سے اپنا ہی بنایا شہر مہار کے چپے جاتے ہیں۔ مجھے دہلی بھی ایسے چند شہروں میں سے ایک لگتا تھا جو عارضی بہ شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس حالی شان اور نیکی سی گاڑی میں بے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جا رہا تھا، میں نے اس گاڑی کے فرش پر اپنا ہاتھ پھر کر رفیق سے کہا: "گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی سے کیا؟" رفیق نے رو رو کر قہقہہ لگایا: "نی احوال ہیں، مگر ایک دن اپنی بھی سو جائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کر کے واپس روٹی کھاتے ہیں۔" گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوئی، جہاں دہلی اونچی دیواروں میں بہت سے چھوٹے لیس بھی بے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے مگر صاف سترے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پان چڑھایا۔ "فریق میں کھانے پینے کا سارا سامان چڑھا ہے۔ کھانا گرم کر کے کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو کھینے کی پھنی سے کرنا یا ہوں۔ رات کو باقی باتیں ہوں گی۔"

رفیق نیک جھپک چائے کی پوری پیانی دو گھونٹ میں خلق سے اتار کر وہاں سے چلتا ہوا بہت کھلے دل کا تھا رفیق اپنا نکل استاد مسکن کی طرح..... مجھے وہ سب یاد آئے تو میں ایک دم اڑاں ہو گیا۔ جس نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر درستی زور وقت نہیں گزر تھا۔ ہم سان بھی کتنے زور فر موٹی ہوتے ہیں۔ ذرا سی دوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اسی ماضی کو یاد کر کے آچیں بھرے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے مگر آج چند تر میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد سناسہ لگی تھی۔ جہاں مجھے ہر پہل کسی کی دست کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دسائیس یہ سب کچھ چھوڑی جانا ہوتا ہے تو پھر ہم ان دردناک اور رشتوں اور خوسا اور آس پاس کے ماحول سے اتکاؤ کیوں جاتے ہیں کر رہی دوری خود ہمیں نوڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ یاد اگر عارضی پڑاؤ ہے تو بچے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے درمیان کام پر لگوادیا، لی حال میرے پاس تیس ماہ کا کام کرنے کا دیرا تھا مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کر دے گا اسے سال بھر کے ورے میں تبدیل کر دے گا اور گھر میں نے محنت و ایمان داری سے پنا کام جاری رکھا تو اس مدت میں سال بہ سال توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک بر تعمیر عمارت کی چند عہدیں منزل میں دیکھ تک پلانٹ پر کام کر کے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے وہی ہوتی تو عوام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر بھرہ ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ جانے کے مانند لگتا۔ صبح بھر بعد جب مجھے میری پہلی تنخواہ ملی تو آگے گھوموں سے آتو نکل آئے، اپنے مالک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے ٹھکی میں بندھے تھے۔ مگر کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس پیسوں کا کروں گا کیا۔ اس دور رفیق کو بھی تنخواہ ملی تھی۔ لہذا شام کو سی خوشی میں وہ مجھے دعائی دکھائے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی، مالک یا دعائی کی شام میں تبدیل ہوتی رات۔ رنگ اور لون کی برسات، ہر چہرہ ڈھلا ہوا، ہر عمارت تھک گئی۔ چپکے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، ہاتھوں میں باتیں ڈالے، اس دس رہا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام کشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس سے کاٹا نہیں، اس بات کا احساس مجھے اس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی بھرے کو جینا کہتے ہیں۔ درہم جیسے مردہ دس کیا خاک جیا کرتے ہیں۔ "رفیق نے مجھے یوں گم سم دیکھے دیکھے تو چپ نہ رہ سکا۔" کیا بات ہے شہزادے کہاں کھو گئے ہو شہر کی رہتیں دیکھو۔ میں نے فوراً چہ کر کہا۔ "یک تو تم

مجھے شہزادہ کہا کرو مجھے لگتا ہے باقی سب کی طرح تم بھی میرا حق اڑ رہے ہو۔" رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تم تو واقعی براں گئے۔ اچھا چلو میں تمہارا دس بہد سنے کے لیے دعائی کے سب سے بڑے کلب سے چل ہوں۔ ویسے تو وہاں کا واحد ٹکٹ ہی ہم دلوں کی سانس بھری کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔" میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ "کیوں تمہارے مالک کی جال پہچان ہے کلب والوں سے؟" رفیق زور سے مس پڑا۔ "ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ صرف یہ کلب بلک سے میرے مالک کے کتنے کلب اور ڈوٹری ایک عظیم اشال کلب میں داخل ہوگی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک طلسم جیسا تھا کہی منزلت کی رات کے لیے ہر منزل پر کارنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی مالک نہیں یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ میری رات کی رانی اور اندرونی حصوں کو جدید اور خود کار لٹریس کے درمیان جس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوئی، ریسٹورن، سونٹنگ پون، گالف اور سونکر کھڑ، شاہنگ پدار، سٹیم، تعمیر، جوئے خانے، بار، رقص گاہیں، کینے اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہا تھا۔ کلب کیا تھا، پور ایک شہر تھا جسے پچاس منزل عمارت میں سمویا گیا تھا۔ چھت پر لٹلی نظام اور مختلف سیاروں درستاروں کو دیکھنے وال ایک پورا ہال بنا دیا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیوینکل ڈور بیوں کے درمیان چاند ستاروں کا معرکہ کیا جاسکتا تھا، کلب میں نوجوان جوڑوں کی سہتا تھی جب دربار اسنے پڑجوم کہ تل دھڑے کو جگہ تھی جو سنے حاسوں اور بڑے کیسیسوں کے باہر اتار کر سنے دلوں کی ہی قطاریں ہاتھ میں نوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا ظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسب معصوب ایک جان دار قبیلہ لگایا درمیر جھٹک کر بولا "اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دعائی ایک لگ ہی شہر ہے یہاں جہیں ہر مذہب کا ہر کارے کا۔ اب یہ اس حیرت کا رکی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتنا ہے۔ عابدوں اور ہدوں کے لیے مسجدیں کھلی ہیں اور زندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں نا۔ "زند کے دعو ہے، ہاتھ سے جنت گئی۔" تو میں وہی معاذ یہاں بھی ہے۔" کلب کی ہر منزل پر جس کے جلوسے اس کثرت سے کھڑے تھے کہ انہیں اپنی محد و بصارت میں سمیٹنا کسی بھی سانس کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسیسوں کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل پلک دیکھ کر چکر ہی تو گیا۔ مذہب سان کو جس چیز سے منع کرتا ہے وہاں سے اس میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ و ثواب کا جیادنی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر مزاج کا رور واد مگر فی الحال تو اس کلب میں ٹوٹ پائے پھینک رہے تھے اور ترقی پاری کے نشے میں مسکور سر ورجرا کا ہر فلسفہ بھلا کر سانس انہوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کبھی کر جاتے ہیں اور کارٹوب بھی ڈرڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسیسوں سے باہر نکل رہے تھے کہ چائیک کلب میں ایک بل چلی سی بچ گئی۔ سارا لمحہ ایک دم چاق چو بند ہو گیا اور عمارتوں کی دوڑیں ملک گئیں، پنا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہرور کریم وہاں پہنچا ہے۔ میں بھی رفیق اور ہاتی سارے لوگوں کے ساتھ ایک جانب نظر میں کھڑا ہو گیا۔ بہرور ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ وہ دعائی عمر کا ایک نفیس شخص تھا۔ مغربی لباس میں بیوس، ہاتھ میں ہونا کا قیمتی مکار، ہیرے سے جوی ہائی ہک اور کف لٹریس امریکی ڈیر۔ کرسوٹ وریچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور اداسی، کھویا کھویا سا دھچھن واقعی کسی عظیم سلطنت کا



سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو پاس نہیں آتی۔ ویسے ہی میری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی تھی۔ میں نے بہت سے امیروں کو قصروں سے بدرجہا کر دیا تھا۔ لیکن میری ہر رات پر امارت لوٹ کر یہی تھی۔ اس کے علاوہ گرواناٹ، شجرہ درہی فنکوں کا ایک ہجوم تھا، مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب شدہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفتی نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی بوئل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عیسے کے لیے شب برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات اس سب کو ایک ماہ کی تسخیر کے برابر ہو سکتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود بھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر رہتے جاتے ہیں، اس کا بریل، ہر فرخچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا کلب کے لیے دولت عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفتی کی یہ ساری باتیں سن کر کہانی سن کر کہنے لگا کہ اس رات بہروز ہمارے قریب سے گرا تو رفتی نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفتی نے موقع غنیمت چاہ کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کے، کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔ یہ میرا دوست بہزی تھا۔ وہ ایک کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں حردوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔" بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "کیا تم بتا رہے ہو؟" میں نے پچہ رہا رفتی نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ "بہزی رادوا لک۔" بہروز کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "حوب! اسے کام۔" رفتی نے رفتی کے فیئر مصطفیٰ کے پاس بھیج دیا۔ "بہروز مختصری بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفتی کو دیکھتا رہا۔" "تمہارا لک تو اردو بولتا ہے۔" رفتی نے اس کو جواب دیا۔ "دعنی میں بھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دعنی کر رہے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں بات کرتے ہیں۔"

کلب سے دعنی پر رفتی مجھے بہروز کریم کی کامیابیوں کی داستانیں سناتا رہا کہ کیسے کامیابی کی بیڑھیں ملنے لگیں۔ رفتی نے رفتی کے بڑے دولت کے آسمان کا نام بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس قانونی کامیابی سے متعلق بہت سی داسر رکھائیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ بے دشتوں کو بھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجہ سے چرے کے پیچھے ایک سٹاک حصص بچھا ہوا ہے جو اپنی کامیابی کے واسطے آئے وہی ہر شے کو جس جس کو دیتا ہے۔ رفتی، بہروز کے بارے میں بولتے بولتے چانک اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر رہے ہیں پڑا۔ "کیونکہ یہی رادے بارے میں تمہیں جس نام سے قیچو ہے، آج دعنی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پٹ کر وہ بارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اے خدا! وہاں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔" گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا، کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرنا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی عربیوں کی طرح چھین گھنے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قاروں کا خیر نہ اور کسی کے ہاتھ خالی کھول کون دیتا ہے۔

اگلے دن رفتی مجھے فیکٹری دیہا میں لے گیا۔ ٹیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکڑ حراج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفتی کو سر سے ہر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفتی کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفتی نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفتی نے میرے کاندر سے ہاتھ مار کر کہا۔ "چل پیارے۔" تیرا کام تو بن گیا۔ یہ میجر تھوڑا سا نیچھا ڈی ہے، مگر ہے مالک کا حاس بندہ۔ اب ہر تمہارے سارے انتظامات میں چٹکی پڑے گی۔ رفتی نے رفتی کے کمرے میں کمرے کا۔ میں نے رفتی کے حکم پر پکڑ دیا ہے۔" اس دن مجھے ایک درہات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو ٹیکڑوں ایسے گاڑی ہیں، جیسی ایک رفتی چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفتی کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفتی کا چہرہ ویدہ رہا ہوگا۔ پانچ روز بعد رفتی نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں بھیجا۔ یہ مجھے خاصی معقول تنخواہ پر فیکٹری کی رات کی شفت میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں وہاں پر گیا۔ مال کا کپیوٹر میں ندرت کرنا اور سپلاں کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں اپنی رے کر رہا تھا۔ گھر واپس پہنچا تو رفتی جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ مٹک سے پینے بیٹھے، اور میں سونے کے لیے پے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگنے اور سونے لگنے تھیں، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا حساس ہوا کہ رات کو اس کی شخصیت ایک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُنجا لاگاری بہت سی سادگی مصلحتوں کو خواہیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام آگئے تو بعد ہم زیادہ رومان چورہ شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے ہیرو کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

میں فیکٹری میں پنا کام رات کے پہلے پہری میں مکمل کر دیتا تھا۔ پھر میں ہونا اور صحرا کا تاروں بھر آسمان، جو رات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوط کا جواب نہیں دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوری سنائی دی۔ میں تیزی سے پیچھے کی جانب پکا۔ چند پرے حذر پر کچھ لوہے کی پائیاں ایک گودام میں سمجھا کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھا چاہی تو فوراً میں نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر میں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے سمجھ کر کہا کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی تو میں صبح ہوتے ہی میرے مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ سنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ "میں یہاں نہیں ہوں۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بتاؤنے کی وجہ سے مجھے چانک ڈیوٹی پڑا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفت بچاؤ کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چہ کا قاعدہ اندر راج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لاہروائی سے حال دی۔ "ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفت ختم کر کے چپ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔" مصطفیٰ کی آواز کھر دئی اور جب بہت خست تھا۔ میں نے اس وقت اس سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا بیجا کچھ بھی ہو۔ بہروز نے میں ایک آدھ دن اس فیکٹری کا دورہ بھی کرنا تھا اور پھر چھٹی رات جب میں نے ادا ملے کے باہر بہروز کریم کے سکواڈ کی گاڑیوں کو رکھتے دیکھا، تو تیزی سے بال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے رستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہوا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے چانک۔ "گے بڑھ کر بہروز کریم کو براہ راست مخاطب کر کے کہا۔" مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" بہروز نے پٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر مل پڑ گئے تھے۔

(جاری ہے)





دور جاتے ہوئے مجھے بھر کے لیے میرے پاس رکھا۔ "مگر جاب سے پہلے کا دھنک سے ملنے جانا۔" میں اپنی جگہ کھم صم سا کھڑا رہ گیا اور بہرہ کمرے سے نکل گیا صبح بخیر سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹ میرے پاس آیا اور ایک ٹونوں سے بھر لیا، میرے ہاتھ میں تھا گیا۔ اس دور مجھے نہیں ہار ہوتا تھا کہ بہرہ کمرے کی اس سلطنت کا اصل دار و مدار کچھ ایسے ہی حیرت انگیز دھندوں پر ہے، جن کی خبر بہرہ والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر غریبی طرح برس پڑا اگر آخر مجھے اس کے چھڑے میں ناگ اڑے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہرہ نے مجھے معاف کر دیا، مگر دوبارہ اگر کبھی آپ کچھ ہوا تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے غصے کے برعکس بہرہ کمرے سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے صبح میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفت سے تبدیل کر دی گئی۔ معطلی سے اب بھی بہرہ کا ہے یہاں سنا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لیے اور تہور میں وہ اپنے جیسی ختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے بڑے بڑے کارڈ کے درمیانے واپسی کا وقت ٹوٹ کر ہوا تھا، تب اچانک رات کی شفت دے لے کارکن نے مجھے معطلی کا پیغام دیا کہ اس نے مجھ کو بل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں ٹیٹ کے قریب ایک شیڈ کے نیچے معطلی کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب کے بعد معطلی کے محافل کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے پتہ چلے کہ "آپ کا اشارہ کیا۔" اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کڑی لگانے کا اشارہ کیا۔ اور اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا۔ "جتنا کمرہ ہے ہو، اس پر کتنا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بناتے کی ہمت رکھتے ہو؟" بہرہ جو اب بہت سیدھا تھا۔ "میرے پاس کھوے کے لیے کچھ حاصل نہیں اور میں اپنی ہمت کرنا چاہتا ہوں۔" معطلی نے غمی ہاتھ نہیں کی۔ اس نے کہا کہ رات کو مسائل پر کچھ لائحہ عمل پر ساماں آئے گا۔ مجھے وہ ساماں وصول کر کے بہرہ کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیور موجود ہوں گے۔ میں سے زیادہ تفصیل میں جانے ہونا بھی پھرئی۔ معطلی نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ "کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہرہ کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ فاس کی نظر سے دیکھ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا ایک سے کوئی تعلق طر نہیں ہوتا چاہیے۔ میرے ہاتھ کچھ گئے ہوں گے۔" میں نے سر ہلایا۔ "آپ نے فکر دیں، میری رہاں ہمیشہ بہرہ ہی کی۔"

رات اچلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی جھپوں میں سو در در کے ایک دربان ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر کا موش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب نہ جہرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لائحہ عمل کا انتظار کر رہے تھے۔ بہرہ نے یہ وہ سات کارندے بالکل جیسی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ درکنس سمندر میں ٹنگر انداز جہاز سے موسیقی اور فوجوں جھڑوں کے گانے بچے کی آوازیں ہوا کے روش پر چند لمحوں کے لیے ہوا میں ٹھہر جاتیں، اور پھر وہی طویل ستارے میں گھیر جیتا۔ آج 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے اپنی کے دروازے پر، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے عمارتوں اور پھولوں سے منے دیکھا تھا، دو جوان لڑکیاں سرخ لباس میں دھڑ دھڑ رنگ برنگی تیلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور دو جوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف باندھی اپنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں ٹنگر انداز جہاز میں بھی ویسا ہی کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! وہاں میں بد صورت لوگوں کا بھی کوئی ویسا ہی منانے کا دن منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں کر ہوتا ہے۔ مگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی حاجت نہ ہوتی چاہیے، کچھ تو ایسا ہو جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کہ اٹنی سیدھی سوچوں کے تصور میں کھڑا تھا کہ چائیک دور سے چند لالچوں کی مخصوص ملتی نکھتی روشیاں نظر آتے تھیں۔ شاید یہ کوئی سنگل یا خاص شاعر تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈش بورڈ کو اس میں سے بٹن نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا، کچھ دیر میں لالچیں ساحل کے قریب آئیں گی اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لالچوں کی طرف بڑھیں گے، جنہیں ساحل سے لگ جلی تھیں اور ہم بھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ دیراں ہفت بڑی بڑی دیوینیکل سرخ لائٹس کی روشنیوں میں جھلکا سا گیا۔ وہ ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں مہل گئے۔ کوئی لاؤڈ سپیکر پر رور ہے مگر یری میں چلا یا۔ "کوئی بھی اپنی جگہ سے ہٹے تو کوئی کوشش نہ کرے، ہم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔" مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلا یا "بھگوان! اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرخ لائٹس چھٹا کے سے ٹوٹ گئیں۔ ایک جھلک رہی تھی گئی، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھٹا جاتا اور اندھیر عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سب نہ جہرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے مگر مجھے رانے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گئی ریت پر اوندھے سے گر ہوا تھا۔ لوہے کی ایک سردیال میری گھٹنی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پتوں کا دست مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پٹیوں سے ہوتا دماغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ بے ہوشی شاید جلدی اختیار ہے اور جلد موت کا ایک چھوٹا وقت ہوتا ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی مصیبت پر لنگ رہا تھا، جب شدید ٹھنڈے پانی کی ایک بوچھاڑ نے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے تار اچھینکا پانی کے دھیرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھلکے سے، ہنس ہنس کی، یا میں ٹوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری روشنی کے ساتھ اس قدر مصیبت سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے دو خور و تار جیسی رستی دے ہاتھوں کی ہڈیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھینچی محسوس ہوتی تھی۔

مجھے کسی پر بھی کر میری گردن بھی رتی سے پیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر، مدھنی گئی تھی کہ میری درمیانی ہتھ سے ودرستی گردن کے گوشت میں بیست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرہ تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں ٹھٹھ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوں اور کسی سے سامنے آکر میرے چہرے پر ایک دردناک اور اٹھنا نہیں سہیہ کی اور عربی میں چلا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا اٹھنا چلا گیا۔ میں نے چلا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قاتل تھا۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ کیا کر رہے ہیں۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ اس کے سوالیہ لہجے میں مختصر اور انداز بڑا سفاک تھا۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، دعویٰ میں کب سے قیام پزیر ہوں اور میرا ان منظر سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں۔ میرے پاس جواب میں سوئے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا ذکر کا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوتہ کو بے کی ایک چھوٹی سی مخصوص ہتھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں جمید کرتی محسوس ہوتی تھی۔ جسم کو جلتے سگڑیوں سے دھتے دھتے سے دھاغا جا رہا اور اس تمام طرے میں مجھے بچوں کے مل کھڑ کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رتی سے چھت پر ایک کندھے کے ساتھ دھڑکے گئے، اس طرح کہ میرے بار دوں پر میرے جسم کا سارا اوجھریوں پڑا رہا ہے کہ میرے شالوں اور کپڑوں کے جوتے کھل جائیں۔ وہ جربا رکتہ کے دھتے میں دوبارہ پنا سوال دہرے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور ادیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سندھ ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح نفس عصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ بھی ہوش میں نہیں آؤں گا مگر میرے ستم گر بہت قریب کا رہا ہے۔ اپنے فتن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے رندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جلا دوں سے کہا کہ اسے ذرا بے کہن میں مریں۔ چاؤں، لہذا میں اسے سلطانی گواہ بنالینا چاہیے اور مجھ سے مدد ملے گی، سنا مپ بھیجے پر ایک سو بدو کر لی جائے کہ گھر میں انہیں اپنے گروہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی قبایلیاں دے دوں تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک یا کسی الزام کے ذی وارث کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہوئے کے بعد دوبارہ میں اس کا حساب تو پا رہا تھا، مگر پھر اس کے بعد ادیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے دھتے سے طویل ہوئے گئے کہ مجھے اب اور رات کی ہر تیر اور کتنی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد و رشت کرے کی تھی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عمر وہاں کے کھاد سے بے ہوش رہی، روح کو بھی ادیت سے ہی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر کچھ لگتے یہ کھاد اور داغوں روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے رہا چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھان سے لپٹنے کے لیے جسم ہی طور پر تیار کر دیا اور رہنما ہے۔ اس میں سے ایک میرے ہاتھ کھونٹے نیچے جھٹکا تو دوسرے نے بے درستی سے ایک لمبی انگڑائی لی کہ وہی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں نا اس 'نیک کام' کو گلے رو کر تک مؤخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی خراب ہو چکی تھی کہ شاید مجھے پہلے اس سے ناخوش کے علاوہ ہونے کا پتا بھی نہ چلتا کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور ادیت محسوس کرے کے لیے بھی انسان کا اپنے احساس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اس روز یا کے ہر دیوے اور خود سے بچانے شمس کی تقدیر پر نوٹ کر دیکھا۔ یہ نہ رہا میں کسی درد کا حمید اور نہ آہرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش، اس دہانے میں کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا۔

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے مگر میرے دس بھی تک کسی آواز نہ تھی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دھنا مجھے یوں محسوس ہو کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ اچھلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گروہ کھل رہی ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی کوئی چارہ درد اور درد جھٹکے دینے کی کوشش کی تو منہ سے جھینٹ نکل گئیں۔ ادیت، درد اور تکلیف سے اور پاؤں کے بندھن سے گئے در میرے جسم کے تمام مساموں سے درد ہوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ لگا، جیسے شدید گرمی کی کڑی روپرو میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کبھی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں جیروں سمیت زمین پر دھڑکے مڑ گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا مچھا گیا، جاے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہو کہ کبھی کی کتنی ٹوٹ چکی

ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے پہنچا ہاتھ آدھ کر دے اور کا پتلی روخی، خون سے سی انگلیوں کے ساتھ اپنے جیروں کی بندھنیں بھی کھول رہیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح کھینچتے ہوئے بڑھتیوں تک جا پہنچا اور پھر چاروں ہاتھوں جیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں میڑھیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک پہنچا، اور پار پار روخی بدن کو پہنچا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کڑی کی مدد سے باہر کی جانب سے بند تھا، در جب میں نے پہلے پارے جسم کے دروں کو دروازے پر دوچار مرتبہ دے، تو چھنی کھل گئی اور میں پہلے ہی دروازے پر باہر کھلے ہال میں جا کر۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک ویرانی یا مکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر ڈکڑا تا ہوا کھڑ ہو گیا اور اس کوشش میں جاے کتنی بار زمین پر گرنا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ناگوں میں موجود ہر ہڈی کو جھینٹ کر پکڑنا چاہا ہو گیا ہو کسی۔ کسی طرح میں اسے تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دروازے میں نظر آئے والے کوبے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں احاطے کی دیوار کا سہارے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک میں اور عمارت کا پار، حادہ تیز روشنی سے جگمگا لگا۔ صرف اندھیر ہی سات کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکاچوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہو گیا اور پھر مجھے بہت سے سامنے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیو نہ دار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے جھلاٹک لگائی، مگر مجھے رستے ہی میں کسی نے دیو بچا دیا اور میں اس طرح بے سندھ سا زمین پر گر گیا جیسے سیلاں میل سمرا اور جنگل میں لگا تا دوڑے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے بھرا ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی نہ ٹھہرے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری ٹانگیں جو تھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آ کر رہ گئی تھی اپنی مہربان آغوش میں لیے کے لیے، ہانکوں کے در پر اپنے حیدر ہاتھ پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیو کی آواز بھی ملانی دے رہی تھی۔ "میری راد" اٹھو چلو بہت دیر ہو گئی۔ "میں نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکار رہا تھا، مگر یہ آواز؟ ہاں میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا 'اسے اب ہوش میں آؤ' یہ مجھے رندہ پائی ہے۔" میرے ڈوبنے والے آواز پہچان لی یہ سرور کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے سرور کریم نے خود بخود اکرواہ تھا؟

۱۰ جلد ہے





کر مجھے بہت پریشانک غور سے، بیکٹا رہا۔" کچھ کہہ گئے نہیں مجھ سے میری وجہ سے تم پر ظلم کیا جسے پہاڑ توڑے گئے، تمہاری نفس میں درکار ہر جھڑپا گیا۔  
 غصہ تو بہت آیا ہوگا مجھ پر۔" میں نے رندگی میں پہلی مرتبہ وہ راستہ بہرور کی طرف دیکھا۔ "نہیں" آپ سے وہی کیا، جو وہاں کسی کی بھی وفاداری  
 چاہتے کے یہ رائج طریقہ ہے اسل کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کمزوری اور مجبوری ہوتا ہے تو اگر آپ سے بھی کمزوری کو آ رہا کر دلا، رنی  
 کی جانچ کی تو کیسا لگے شکوہ۔؟" بہرور نے اس جھکی سے پوچھا۔ "خوب گویا وفاداری پر کھٹے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جانتا چاہوں گا۔"  
 "جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور درد کمزوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آرمود طریقہ ہے، مگر جسے درہنہ اور دیت بہداشت  
 کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟" بہرور چپ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس دیا میں ہر سان کے لیے قدرت نے ایک  
 لگ احسان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں غصہ اور کہیں نقد اور آپ سے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزارا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے  
 کہ یہ میرے حصے کا انتخاب ہی نہ ہو۔؟" بہرور نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروزہاں نے جلدی سے ماسٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا "تم ٹھیک  
 کہہ رہے ہو، مگر میں اپنے وفاداروں کو تباہ کھو دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، بلکہ ایک بات تمہاری دس ٹوٹتی ہے۔ واقعی  
 وفاداروں کی دلتا اپنے کا کوئی حقیقی پیار۔ ایجاد ہی نہیں ہو سکتی۔ انسان کے خوس ہی میں وفادار ہو تو یہ صرف دل بہادری کی آزمائش ہیں۔ مجھے تمہاری  
 صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری توت برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالانکہ ایکے میں تم سے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال اب تم بھی ہماری ٹیم  
 کا حصہ بن چکے ہو، مگر یاد رہے، جس، یا میں تم قدم رکھتے جا رہے ہو وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا، مگر تم اگر  
 چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر اپنی تمہارے ملک و خست کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم تارے رور، در لٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر  
 تمہاری وہی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔" میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں  
 آئے سے پہلے ہی میں پے دہی کے سارے راستے بد کر چکا ہوں، درد ہی کی فکر دو کرتے ہیں جس کی واپسی کا کوئی مختصر ہو۔ میرا کوئی آگے ہے نہ  
 پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟" بہرور نے اطمینان سے میری بات سنی اور پھر کا مدعا چھپتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "پہلے تم کھل صحت یاب  
 ہو جاؤ، پھر بہت کام پر ہے میں تمہارے کرب کے۔ وہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا کیوں کہ یہاں  
 سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔" بہرور کریم کمرے سے باہر نکل گیا

فیروزہاں جان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس نکلا۔ "تم واقعی بہت خوش قسمت ہو، لڑکے، لڑکے کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی  
 سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندرست ہو کر باہر، تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔" فیروزہاں چلا گیا، اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں  
 رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ پتا سامان ہانڈھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے پتہ گیا "اچھا ہوا تم آگئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر ابولسی والی ٹیکسٹری میں  
 ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا، میں سے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوا دے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ  
 میں رہو گے" میں خاموش رہا۔ سب میں اسے کیا بتانا کہ تارے رستے جد ہو چکے ہیں، میں رفیق کو رخصت کرنے اور چورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور  
 جہاد صفا میں بلند ہوئے تک ہار لاؤنچ میں کھڑا رہا۔ ہماری رندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری  
 محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان سے کو تاہ نظر کریں ہوتے ہیں؟ پے قریب کی چیزیں، ارشٹے ناتے  
 در لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ سب ہی جذبوں اور رشوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ہماری دنیا چھان بیٹھتے ہیں، مجھے تو ایسے بھی دوچار  
 دن میں بہرور کریم کی طرف سے دیے گئے پاپارٹمنٹ میں شمش ہو جاتا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوہیں گھٹنے بھی اس فلیٹ میں میں رہا  
 گیا، میں نے فیروزہ کو کہہ بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کرادوے۔ جواب میں فیروزہ نے شام تک ایک بڑے فرزند پارٹمنٹ  
 کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہاز سی سڑک کے اس پارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز سی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قریب سے سبائی  
 گئی۔ تکی بی بی خواب گا، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قابیل، روشنی پڑے، وفادار، بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں سے جی  
 یو اریں، ساتویں منزل پر سنے ہوئے اس پارٹمنٹ کا سمندر کی طرف گھٹنے وال نیرس در وہاں پڑی وہ بیدنی قیمتی آرام کرسی۔ بلے بھر کے لیے مجھے اپنے  
 گھر کی چھت پر بنا دہ گودام ہا چھوٹا سا کمر پاد گیا، اور میری آنکھیں بھلگے گئیں۔ اس چھوٹے سے ڈوبے ما کمرے سے کہ اس ماں شان پارٹمنٹ  
 کے سر میں نہ جانے میں نے پایا یاد تھا یا کھویا بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی  
 کہ بہرور کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قافلوں کی نظر سے بچ کر جاری تھے۔ فیروزہ سے مجھے اتنا ضرور بتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ در پردہ سونے  
 کی سنگٹک کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ دولت کی نا بھی تو یک جہ ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا احتیاج اور جیوں، ورن بہرور کریم کو بھلا مزید روپیہ کیے کی کیا  
 ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک رش ہے۔ کچھ لوگ فریج کر کے اس شے کا ٹنڈر محسوس کرتے ہیں اور کچھ حق کر کے۔ اسی دور مجھے ایک در در اک بھی ہوا  
 کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے، وہ غلامی سے ٹنڈر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے، اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ  
 بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور، پروا ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھٹکا چار پائی پر بھی بھولنے بھولنے میں آ جاتی تھی اور آج جب  
 میرے پاس دینی کے سب سے پوش علاقے میں سبکداری اپنی خواب گاہ کی رزم مسکری پساری رات بے چینی سے کر دینیں بدلتا

رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروزہ خان کا پیغام آ گیا کہ بہرور کچھ دن کے لیے شیر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی حامل میٹنگ



کے لیے اپنے معاملہ واسے جنگل پر بلا دیا ہے۔ سہ پہر کو ذرا بخور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار محزیہ ارکان کو لیے دو بہرہ کریم کی شاہدہ رہائش گاہ پہنچائی گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہرہ کو صرف کھانا نہیں خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس سے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں سانس کاغذ اور اس کی رہائش کا خلیق اس کے اندر کے آدمی کی حرکت یا سرنگی ظاہر کرتے ہیں۔ بہرہ کریم کا یہ مالی شان محل اس شان کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب چوبی میں دینی کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہرہ کو دنیا کی تیار ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پالی کی ایک سہری، جس سے پرے، ہنر سے پر ایک وسیع دھریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر درختوں کے ٹھنڈے شہم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے دن سب محبوس کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہرہ کے بھٹے کی انجینیسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری شیخوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے رکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انجینیسی میں داخل ہوئے تو بہرہ در فیروزہ حاس پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہرہ نے مجھ سمیت سب کا حاس پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے چاہے ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے بند چانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی بعد بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروزہ کو اس عرصے میں بھی رکاوٹ کی ایوانی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی، فیروزہ نے سب کو مختلف اوجھڑے کام اور دوسوے بتائے جو اس عرصے میں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچائے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی غرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف میں ہی کھڑ رہ گیا۔ بہرہ کریم نے مسرورہ فیروزہ سے پوچھا: "کیوں فیروزہ جان! پوری رو سے تمہاری بہت دوستی ہوگئی ہے کیا، سے کوئی کام نہیں دیا تم سے؟" فیروزہ جان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا: "یہ ابھی یا ہے، مالک۔ اور سے کوئی پرنا سود بھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتادیں۔" بہرہ نے اپنا مخصوص رکارڈ لکھا اور فیروزہ نے انٹر سے اسے سلا گیا: "ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک حاس کام ہے، تم جانتے ہو پڑی راہم میرے گھر آپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریصوں اور میرے دشمنوں کی سب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بدوئے کار ناچا جاتا ہوں۔" میں نے سر ہٹا کر کہا: "میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔" بہرہ نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ عمل اپنی چوتھی بیوی کے لیے فیروزہ کر دیا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ درانی بھی ہے۔ اس کی ہائی دو بیگمات نہیں دی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا سندس میں رہتے تھے۔ وہ سندس اپنے اسی بیٹے کا کسی نام و در تفصیل اور اسے میں دھند کرانے کی غرض سے چار رہا تھا۔ لیکن اسے اپنی سنی کم سن دہن کی بہت زیادہ لکڑ لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہرہ نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان ہیرا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو بھی بہرہ کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ مگر وہ کریم کی نئی بیوی دہن کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہرہ کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے ادب بکلی تھی، لہذا وہ اپنی سینیٹیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی حد کرے لگی تھی۔ بہرہ اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہوئے کے باوجود سے بچے کسی پرے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہرہ کے پرے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کا مطلب ہی بہرہ کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہذا بہرہ چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ذرا غیور کے ساتھ اس کے ساتھ چاؤں۔ دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہرہ کی دہن کو کسی گارڈ کی موجودگی کی گنجھ سے بچے بھی بے جبر رکھوں کہ سے اس ریر میں دینا ہے خطرات سے آگاہ کر کے بہرہ اس کی مددگی وجہ رہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، اللہ جس گاڑی میں میں ڈرائیور اور بہرہ کی دونوں گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہرہ کے حاس و خاؤں کا غلطوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ضرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور اس کا خاؤ سے لوں پر میرا بھڑکے گا تا کہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ ہلک جھپکتے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہرہ نے تعذیر کے لیے میری طرف دیکھا: "سب سمجھ گئے ہاں، کوئی بات چوتھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، مثل صا میری جان ہے۔ اسے کبھی ہی کھروٹی بھی نہ تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی ر۔" میں نے سر ہلایا: "نہیں، مالک۔ میں جیسی طرہ سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔" بہرہ مسکرایا: "شاہاں! تم ظاہر نہیں کرتے مگر کافی ڈہیں ہو۔" میں چپ رہا، مگر جاتے کیوں مجھے اس ساری کہان میں کوئی ایک جڑو ہار بھارانی تھی، جیسے بہرہ نے سب سمجھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت حاس گنجھاپا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا ر میرے آس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتائے کی کوشش کر رہا ہو، پر قاتلہ پارہ ہو۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آکر بتایا کہ لکلی صبا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہرہ کریم نے نچتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آئے کا اشارہ کیا۔ "تم بھی وہیں جاؤ، میں تمہارے تعارف بھی لکلی سے کرو دیتا ہوں۔" میں بہرہ کریم اور فیروزہ کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس محل کے بال بال ملاؤں میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے ٹینس اور خوب صورت سفید رنگ کے بیواؤں کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیاسٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے ہمارا دکھا دیا بھی تو کہاں؟ سننے میں اوپر کی مزرع کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی میڈیٹیوں پر کسی کے بازو قدموں کی آواز گونجی، میری نظریں خود بخود ٹھٹھک گئیں، آئے وہاں رکت سے پاؤں دھرتے نیچے اتری تو بہرہ نے مجھ سے کہا: "ن سے ملنے کی راہ، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکین، مثل صا۔" میں نے جھپکتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک ہل کے لیے بجلی گر گئی۔





ہوگی۔ ہاؤڈنیر۔ تمہاری محنت کیسے ہوئی مجھے پتہ نہ تھا جو بے دینی کی۔ اپنی اوقات میں رہو نہ۔ اس بار مجھے اپنا بوجھ سمجھ کرنا پڑا۔ معاف چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے۔ ہمارے تعاقب میں آئے۔ دس گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے اس کی پہچانی سے یہاں ہوس ہوا تھا۔ جیسے انہیں ہمارے یہاں زیادہ دیر رہنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ پہلی دفعہ سے اداست ہستی، پورے پختی اندر لفت کی جانب بڑھ گئی۔ پندرہویں منزل پر پہلی کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے پارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں ہوں میں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ پہلی اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے ہوئے، کتے بیچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ پہلی نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اس کی پہلی کو پارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر وہیں گھر چلے آئے۔ پہلی نے گاڑی سے اترتے ہی چپ کر فیروز خاں کو صاف ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انیسویں منزل آکر بستر پر در رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خاں بھی وہاں مارا ہو گیا۔ تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج۔ ہاں، وہ، کیسے جا۔ کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔ فیروز نے ایک ہی سانس بھری، تھوڑے ہی لمحے میں لوہے سے آئے، تو بھڑ ہے۔ پہلی مالکن، مالک کی بہت جھڑپتی ہیں۔ وہ یہ سب بدوشت نہیں کریں گے۔ یوں کچھ لو کہ تم ایک دودھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن بھرا رکھنا ہے، ورنہ کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہرہ ذرا کرم کا حکم دیتا تو پہلی کی ناراضی یقینی تھی، اور اگر پہلی کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے اس سے ڈر رہتا اور مکمل نگرانی کرتا تو بہرہ ذرا کرم مدد ملی ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میری مقتدر تھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے ہاں سے بیاو کی مدھرتا میں ابھرے گئیں۔ کوئی بیاو پر بہت خوب صورت ڈھن بجا رہا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہاں کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز ستانی بیاو بجاتے ہوئے پہلی کو بیاو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے داؤغ کی کھڑکی سے ہاں کے اندر کا منظر دیکھا تو نئے قدموں والیں چلا آئیں۔ گویا پہلی کو بھی بیاو کیسے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم رکم خوب صورت اور بد صورت لوگوں کے عدد ایک سادل ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بد صورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز پہلی صبح سویرے ہی کہیں جاے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید در بیدار تک بہرہ ذرا کرم کی ہدایت پہنچی ہو گی تھیں۔ ورنہ پہلی کا دل چلتا تو وہ انیسویں منزل پر بیاو کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ پہلی نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈر سے جیسرہ کی طرف چلنے کے لیے کہا اور غور و فکر وہ شام تک مال میں خرید رہی کرتی رہی۔ جاے یہ بہرہ ذرا کرم کو شاپنگ کا تاجہ کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی جھوٹ ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپس کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی بیاو کی اس خوب صورت ڈھن کی آواز سے گھر کے باہر نکلیں تو کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت کو کہ جو ساری عمر گھر کی زبان سے دو ٹوٹے ہوئے سننے کو ترستی رہی۔ اور پھر ہماری سماعت نہالوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی نکمیری دیکھ کر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بہتے پانی کی شور، ہارن کی خاموشی، بیدوں کی ٹپ ٹپ، سرسراہٹ ہو، جھروں اور اسی منٹھی ڈھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ سو، جب بیاو کے بے چھری، تو میں بے اختیار انیسویں منزل پر آکر ہمارے چھپے میں داؤغ کی کھڑکیوں کے آس پاس بیٹھنے لگا۔ جاے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آنا بند ہوئی اور بوڑھی بیاو پچھلے سر پر اسکاؤٹ ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر سے سامان کیا، اور بہرہ ذرا کرم کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کر دیا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ اس کا نام، مار تھا، تھا، میں نے مار تھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی بیاو بجانا سکھا سکتی ہے، میں نے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا مگر مار تھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں بھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بیاو تو نہیں ہے۔ وہ تو کہیں کس کا سولی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے چچا اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں بیاو سکھا کر اپنا گزراہ کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میری امیدوں پر افسوس گرا گیا۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں جھپکیں، "گھر میں کبھی بیاو بجانے لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھائیں گے؟" مار تھا میرا سوال سن کر زور سے مس پڑی۔ ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق رکھتے ہوئے میں تمہاری بیس بھی "دو دوں گی۔" مار تھا بیٹھے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دس میں یہ جواب پہنچے لگا کہ جاے کب میں بیاو بجانے لے دوں گا اور مار تھا سے پہلا سبق دے گا۔

اب میرے پاس جیسی حامی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پورا خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انیسویں منزل میں بیاو بجانے کی جائزت شاید مجھے بدل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کرہ نہیں بدلتا رہا کہ میں کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دلی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خوب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ اس میں بھی عجب ہے، خوب دیکھے تو راتوں پر فریب دینے، جاں بٹنے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب۔ میں تو "میری رات کی طوالت سے اسے بے دردی ہوئے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا، تو سرد در سے پھٹ رہا تھا، ستر چھوڑنے کو بالکل بھی من نہیں کر رہا تھا، مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری نے عیالی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو چکنا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار پھینکے، مار سے دروازہ آگے آنکھوں کے ساتھ پورے میں چلتی گیا۔ مگر توقع کے برعکس، ابھی تک وہاں کوئی گاڑی روکتی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ستر دوسری گاڑی میں محاذ جاتی چو بند اور تیار بیٹھے تھے۔

کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس سے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنڈن میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں ابھرا ہوا داؤغ کی جانب بڑھ گیا۔ جاے ب کیا آفت آنے والی تھی، پہلی کے مزاج کا کچھ بہرہ دانی نہیں تھا۔ ورنہ بات بھی تحقیق طلب تھی کہ یہ فعل کثرت نفس کی وجہ سے تھا یا کثرت در کے سبب کیوں کہ یہ دونوں ہی بے دروغی اور پید کر کے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہاں میں داخل ہوا تو خلاف معمول پہلی بڑی بے سکونی بیاو کے قریب بیٹھی اس کے ہاتھوں سے تھیں رہی تھی۔ مجھے کچھ کراس سے دروازے پر بیاو کی کھوپڑی پر ہاتھ بکھیرا اور مجھ سے کہا "تمہیں بیاو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی، "میں نے کل شام تمہاری اور مار تھا کی گفتگو سن لی تھی۔ تم چاہتو ہی بیاو پر مار تھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں بے دردی کی۔ دو میری کوئی بات نہیں ٹالنے، میری چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کرم حاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں آنکھوں میں پڑھ لیا۔ ہاں مگر بے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

پڑے گا۔" کیا تھو، میں کچھ سمجھ نہیں۔ "دوسرے جھک کر بولے۔ جب سے میں اس محل میں آئی ہوں مجھے یوں لگتا ہے، جیسے کسی قید خانے میں آگئی ہوں، بہرور مجھ سے محبت محبت کرتے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں میرے مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط کی بجائے کبھی کبھی میرے دم گھونٹنے لگتی ہے۔ میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں، ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں، وہاں ترکی میں تو، میں کسی تعلق کی طرح اذنی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پھرے ہیں۔" میں نے دھیرے سے سر اٹھکانے جو بول دیا "یہ سب آپ ہی کی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے۔ ہالک کے شمس بہت ہیں۔ جو ہر مل سے ان کے نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔" سٹی کے واسی سے ایک مرد آدھری جاتی ہوں میں، لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح بہروں میں لکھنے سے میں آنا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہوں گا۔ "شرمیں، سکارف اور نقاب کے ساتھ سارے دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔" میں نے بے بسی سے اس صدمہ لڑکی کی طرف دیکھا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" لیلی نے عورت سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود اٹھ کر گئی "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دم بھلاؤں کہ میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا اذنی داتی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔" میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلی نے جلدی سے بات جوڑی "میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں کر رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں تو مذاق پسندی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھادے کہ یہ میرے ساتھ گھر سے نکلا سرور کرو، مگر کسی مال یا شاپنگ پار میں نہیں، سکارف اور نقاب پہن کر پناہ لیں، جس لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کیسے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دو بارہ وہیں آجایا کروں گی، لیکن ہم دونوں گھر سے ہی باہر نہیں گئے جیسے تم مستقل میرے ساتھ تھے۔" غائب ہو کر وہاں رہا، گاہے گاہے ابھر بھی سب پہ قائم رہے گا، اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے اس ساری رات بھر سے آ کر دو گھر اپنی زندگی جی لیا کروں گی۔ یوں، میرا ساتھ دو کے بری راہ۔" پناہ لیلی صبا کی رہا سے نکل کر میں روڑے سے چٹکا۔ اس نے بے تک بھی مجھے یوں براہ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ بچے، کچھ لڑکیاں کچھ لفظ اور کچھ بولوں کی ایک جہش ہی سے عام سے حرف، لفظ اور نام کہتے محترم ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پھل تھا، میں بھری میں یہ بھوں گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکار رہی ہے، مگر میں، بے تک اس بچہ جیسے کہ کون اور جڑ سے ناواقف ہی تھا۔ لہذا میرا جواب بھی سیدھا سا دوسا تھا۔ "شاید، ہالک میریوں راز میں چھپ کر پناہ لیکھنا پسند کریں۔ میری حدود اس راز سے باہر تک ہیں" لیلی نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ "کوئی بات نہیں، تم اپنی نیکی میں پناہ لیں گے۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی تمہارے لیے ایک یا پناہ لو لکھ کر دیتی ہوں۔ ویسے بھی بہت عرصے سے نیکی کی نئی ترین وائرلش کا سوچ رہی تھی۔ اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا۔" جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں رہی تھا۔

اگلے دو دن کے اندر نیکی کو اس پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ یارنگ نے پروے، قہقہے، ہنسنے، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا خوب صورت بنانا، جب کاری کر دیا تو نیکی کے ہاں میں رکھ کر اس کی تشنگ کر رہے تھے، تو میں دیکھ کر اپنے ایک دیرینہ خواب کو پورا ہونے، کچھ ہوا تھا۔ خوب حقیقت میں ڈھلے لگیں تب بھی بہت دیر تک نہیں خوب ہی لگتے ہیں۔ شاید سنا سنا کا بے شمار ہے یا پھر مجھ جیسے، جس کے خوب سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ اسی شام ہمارا تھا۔ مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں پناہ لو کی بنیادی ٹیوشن اور ضرور کے بارے میں پہلی نکلاں دی، اور تیسرے دن میری انگلیوں سے پہلی مرتبہ کسی ڈسک کو چھوئے۔ اس دو مہینوں میں دوسرے گھر سے باہر لگی اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المکز۔ شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس سے پنے منصوبے کے مطابق خود کو سکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا۔ میں وہیں، ایک کیسے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور قریباً تین چار گھنٹے کے درمیان وہ وہیں لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں طرف آگے اور چارے کے راتے واقع تھے اور سٹی نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے رستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اسی سٹی سے ملنے کے لیے گئی، جہاں میں بھی ایک بار اس کے ساتھ چکا تھا، مگر اس بار اس نے مجھے نچلے طور ہی پر کئے کا اشارہ کیا۔ وہ حواقت کے دریچے اوپر چلی گئی، بہرور کے دوپٹے آئے میں ابھی دو دن باقی تھے میں نے سٹی کی بات مان لوئی تھی، مگر میں بردہ سے نہ جاتے کیوں ایک جیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ میں بہرور کا حکم مان کر بہت کر رہا ہوں، مگر سٹی کی راوی کی حواس بھی مجھے جائز ہی لگ رہی تھی، عجیب کش کش جاری تھی میرے دن و دماغ کے درمیان۔ اس کہتا تھا کہ سٹی کا ساتھ دے کر میں نے کچھ سنا نہیں کیا، مگر دماغ کچھ لگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ حاسے یوں اور دماغ نامی دوسو کنوں کی آپس میں کبھی جتنی کیوں نہیں۔ اور پھر جب اس شش و پنج نے جب مجھے پوری طرح غصاں کر دیا تو تیسرے دن سٹی کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ سٹی جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر لگی، میں بھی کیسے سے نکل کر اس کے پیچھے ہل پڑا۔ سٹی نے خود کو ایک جی سی عمارت سے ڈھانپ رکھا تھا، دو دروازہ پار کر کے دوسری جانب بنے ایک پارکنگ میں پہنچی، جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کروزر پارک ٹاپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ گاڑی میں پہلے ہی سٹی کی دوست کے پارکسٹ کے نیچے کھری دیکھ چکا تھا، مطلب سٹی اپنی سی دوست سے ملنے جا رہی تھی یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی نیکی کو ہاتھ دیا اور "ہے آگے جاتی سیاہ گاڑی کے پیچھے چلنے کو کہا۔ میں نے سوچا یا تھا کہ میں لیلی کو بتائے بغیر اس کی نگرانی جاری رکھوں گا، اس طرح میری، بھٹس کا حل بھی نکل آئے گا اور سٹی کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ دہی کی سڑکوں کا جھوم اور نیکی کے لیے مقرر دروازہ کی حد داری گاڑی کی راہ میں حائل تھی، مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن پھر ایک سنگل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے سٹی کی گاڑی نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوئی، اوچھل ہو گئی۔ سنگل کھلنے کے بعد نیکی ذرا اندر نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں، مگر کام نہ رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اسی مال کے باہر آ کر رک گئے، جہاں سے میں نے نیکی پکڑی تھی۔ مجھے کیسے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تب کہیں چار سٹی کی صورت دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، ہم وہیں گھر پہنچے تو سٹی نے کراہ کر اندر چلی گئی، اور میں نے نیکی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے صعب میں ایک گرج دار آدرا گونجی، دہی، یہ کہاں لگا دی تم لوگوں نے..... میں گھبرا کر داخل ہوا، کچھ فاصلے پر بہرور کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)





ہاشم ریم

ہاشم ریم، جوانی میں کے پیسہ بد و صلب سے محروم، ہمدرد اور مہربان نگار ہیں۔ ان کے ”حد“، ”محبت“ اور ”بچپن کا دھبہ“ نے بین الاقوامی پرائز حاصل کی تو ایک مسند پر بیٹھ کر ان میں شائع ہونے والے ناول ”عید بد“ بھی وقت سے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی خدمات پر حکومت پاکستان نے ان کا ”قلمی خدمات“ کا تمغہ عطا کیا۔ ان کے ”حد“ اور ”محبت“ کے ناولوں میں ”انٹرنیٹ فلم“ کی تخلیق کا فی ثبوت ہے جس کی تہہ چھپتی ہیں۔

پاکستان کی فنیف جہتوں سے حسرت و اندوہ سے بھرپور مملکت ہے۔ یہاں یہ شخص کی کھینچنے سے ہر انسان کے لیے ایک نیا جہان کھلتا ہے۔ ہرگز مسرت بھولنے کا۔ ہمارا چاندنی پرانا ہے۔

یہ نیا جہان روزنامہ جنگ، شعبہ منظرین، اخبار معزز، آئی کی چندر گھروڑ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@anggroup.com.pk

بہرور کی آواز اس کراہنے کے لیے تو جیسے میر خون ہی خشک ہو گیا۔ سان اپنا ہر توڑے بڑے ڈ کے ہار کر صاف نکالنے کے لیے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری چھپائے نہیں جھینپی۔ میں نے بڑبڑا کر سرور کو سلام کیا۔ ”مالک آپ دایں آجئے؟“ ”بہرور مسکریا“ تو کیا کچھ لفظ کیا دایں آکر۔ مگر تم لوگ تھی دیر سے کہاں تھے؟“ میں نے نظریں اٹھکا کر صرف بتایا کہ مالک کو کچھ ضروری خریدی کر رہی تھی۔ لہذا وہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہرور نے اظہار اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سلائے اور سن کرنے کے لیے ہمارے ہر ارش برادر اوپیل جاتی ہیں، مگر سارے رے رے کے دیر، مکیم اور طیبیل کر بھی کسی دو ایڈریٹس کر پائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے چاگے ہوئے میسر کو سدا دے۔ بہرور کے گھر وہیں لوٹنے کے بعد سٹی کے باہر ٹکنا نکم کر دیا۔ اب وہ تیس چار دن بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھری میں رہتی۔ ان دنوں میں مجھے مادہ سے پراسٹیکس کا بھرپور وقت ملا اور میں نے بھرپور لکھنا شروع کیا۔ خود مادہ بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تنہا میٹھا پانی پونے کسی فی دس کی مشق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر گمن ہو گیا کہ مجھے نیکی کے دور والے سے اندر ہاں تک آتی قدموں کی چاپ بھی سنائی۔ ”یہی اور چو کا اس وقت، جب میں مہر میں بہرور کریم کی بھاری آواز گونجی۔“ ”اچھا بھائی ہے۔“ میں گھبرا کر چونک سا گیا، اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”معاف کیجئے مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔“ ”بہرور نے فور سے میری طرف دیکھا۔“ ”سان کو پنے ہر تانگن نہیں ہونا چاہیے کہ پنی طرف بڑھے و قدموں کی چاپ بھی۔ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے دوبارہ معدرت کی۔ اس نے ”گے بڑھ کر پیاوٹی ہے دماغ سٹاپ پرتا ہد بھیر کر سے غور سے دیکھا۔“ ”مجھے صاف بتایا تھا کہ اس نے نیکی میں پیاو رکھوا دیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالک کا ہتھار جیت لیا حالانکہ سٹی صابھی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے۔“ ”یہ کیا جادو ہے تمہارے پاس یہی رادہ نہیں بھی تو تھا؟“ ”میں نے چونک کر بہرور کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر حسب معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں چپ رہا۔ بہرور چند ضروری برائیات دے کر واپس پلٹ گیا۔“

گلے بیٹنے کی ابتداء ہی سے محل کی فی سجاد اور ترنم شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد سٹی صابھی کی سان گرہ ہے اور بہرور پچھلے سان کی طرح سے نیجائی معلوم وہاں سے منانا چاہتا ہے۔ سٹی بھی نیجائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے سٹی کے اس کھنسنے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری آواز بھی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی ہے ساتھ ایک نامعلوم سی داسی لے کر رد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات تو اس کی ہے۔ تووری ہی پریشان، بقرری اور بے چینی بھی ضروری ہے، از مدگی کے ترار و کو۔ ابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہرور سان گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے لال میں بیٹھا ہم سب کو مختلف برائیات دے رہا تھا کہ چانک فیروز خاں پریشانی میں تیر تیر قدم اٹھاتا بہرور کے قریب آیا اور تھک کر بہرور کے کان میں کوئی بات کہی۔ لیلی بھی ”سی دقت وہاں پہنچی تھی، اس سے بہرور کے چہرے پر پریشانی اور کشمکش کے آثار دیکھے تو فیروز خاں کو جھڑک دیا۔“ ”تمہیں کتنی بات کہی ہے میں نے فیروز، یوں وقت سے وقت تمہیں پریشان مت کیا کرو۔“ ”فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہرور سے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا ”ایک آدھ دن آگے نہیں ہو سکتا یہ سود“ ”؟“ ”نہیں مالک، وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا کہا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔“ ”ال کا زیادہ دیر خریر سے پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔“ ”بہرور نے ایک گہری سانس لی“ ”مگر فیروز خاں اتنا جانتے ہو کل تمہاری مالک کی سان گرہ ہے، اور میں پورا سان میں دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔“ ”سٹی نے پٹا کر پوچھا۔“ ”کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے؟“ ”بہرور نے ٹھنڈے لہجے میں لیلی کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سود ہے کے لیے وہ اور اقوس کے لیے ایک قریبی خریر سے پرجانا تھا۔ یہ سود اپنے سے طے شدہ تو تھا، مگر فیروز نے بھی آگے بتایا کہ انہیں آج شام ہی لکنا ہوگا۔ لیلی یہ سنتے ہی عین سے کھڑی ہو گئی۔ ”لنیک ہے آنا تو پھر آپ جائیں اپنے ضروری سود کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرے کی کوشش نہ کیجئے گا نہیں منانی مجھے کوئی سان گرہ وغیرہ۔“ ”سٹی پیر پختے ہوئے اندر چلی گئی اور بہرور اسے ”اور میں دیتا رہ گیا۔ سٹی کے جانے کے بعد بہرور نے مجھے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔“ ”کر دیا ناں اسے ہمارا، فیروز خاں۔ تم بھی موقع مل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔ میں اسے منا کرتا ہوں۔“ ”بہرور بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح پنی محبوبہ کی کوروا منو کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو سٹی صابھی اسے پورے تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ بہت اس کے چہرے پر ہنسی کے آثار بھی تک لہا ہاں تھے اور وہ بھی کبھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہرور کریم جہاں سے پہلے جہاد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیلی بھی پلٹ کر پھر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نہیں کرنے کی رنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیسے وعدہ سے تو نبھ بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیسے وعدہ سے سدا وفا ہونے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ جس نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ بھر پور کی دی ہوئی بات پر پوری طرہ سے عمل نہیں کر پاتا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع سبلی نے سر شام ہی کہیں جانے کی غصاں لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر سبلی کی سبلی رہتی تھی۔ میں نے سبلی سے وہ لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں ریادہ دینے نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ ہالک سے مجھے جانے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ اس دلوں میں سبلی کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیوں کہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جا رہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ سردی لگا کر انہیں کوئی بھی تنہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سبلی نے میری بات سُن کر ایک گہری سانس لی۔ "ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر وہاں آ جاؤں گی۔ میری دوست بے میری سارے گروہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ سبلی تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیسے وعدہ کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے، وہیں قہر خانے کی پارکنگ میں کھڑا رہ گیا۔

شام تیزی سے داخل رہی تھی اور پارکنگ لائٹ میں لگی جیوس، دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلن شروع ہو چکی تھیں۔ جب سبلی کو گئے تھیں مجھ سے ریادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ سبلی تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اچھا سکارف پہنتی کرپس میں رکھ رہی تھی۔ "آپ سے بہت دیر ہو گئی۔ آج تو ہم نے اتنے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق کھانپوں کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔" سبلی نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ "ہاں، اُس دیر ہو گئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے دور سرکہ کی چند ضروری چیزیں لیے گئے ہیں۔ چائے لکھ گئے تھے، لہذا اتنا بے کاسوقع ہی نہیں ملے۔" میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اُسی وقت تہہ چاے کی مصنوعی سردی میں ایک بھاری آواز گونجی۔ "میں بھی کیا جلدی ہے جاں آغا، کچھ اہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک پہنچے ہیں۔" میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دور دھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہرور کریم اور فیروزہ جال، تر کرہاری جانب بڑھتے دکھائی دینے لگی۔ میں منظر میں کھانپوں کی وہ چپ بھی نظر آئی جسے میں اور سبلی اپنی دوست میں چمک دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ سبلی کے چہرے کا رنگ بھی میل بھر میں رو پڑ گیا، اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کانپنے جیسی لرزش دیکھی۔ بہرور نے سبلی کے قریب پہنچ کر پہاڑ سے اس کی غلوڑی اٹھا کر لپٹ لیا، چہرہ بلند کیا۔ "یہ کیا بات ہوئی جاں آغا، میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل گئیں۔ کیا کوئی نئی کشتی تیار ہے تم سے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملو، جس کے پیار میں تم کی کشش ہے۔ تم نے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ رکھا، پانچ "سبلی نے جلدی سے تھک کر بہرور کے پاؤں پکڑے، "معاف کر دیں مجھے، آغا، بڑی بھول ہو گئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکا دے میں گئی تھی۔" غصہ اسی غلطی بھی نہیں ہوگی۔ "بہرور کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ "میں تمہیں تو معاف کر دوں گا جاں آغا، مگر اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں سبکا کر گھر سے نکال اور میری علم برداری کی۔ مٹاؤ، کوں ہے وہ بد نصیب۔" سبلی نے پنا آفسوں سے بھینکا چہرہ اٹھایا، "کہا ناں آغا، بڑی غلطی ہو گئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے ادب گئی تھی۔ اس سبب یہاں چلی آئی۔ یہاں باپ فلور پر ایک بہت بھرا ستوراں ہے۔ سوچا کافی پی کروں سیدالوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔" بہرور نے دوبارہ سختی سے پوچھا، "کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آتے پر مجبور کیا؟" سبلی دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھادی۔ "یہ بہی زاد۔" میں مجھے اس طرح کی انٹی سیدگی پیٹا پڑھنا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری پٹی ہے، مجھے اے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔ میں کوئی دھیرے میں قید اقدیدی تو نہیں ہوں کہ ہر سو گھٹ گھٹ کر جیوں۔" سبلی چپ چاپ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر ہی میں پے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری سبلی سے نظر ٹٹی اور مجھے لگا، میرے سامنے سبلی نہیں تاہم کھڑی ہے اور ہم دونی میں نہیں میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہرور کریم نے اطمینان سے سبلی سبکی بات سُن لی اور میری طرف پنا "اچھا تو یہ ہے وہ تنگ حرام۔ اس سے مجھے انکی امید بڑھ گئی۔ مگر جاں آغا، تمہیں تو کچھ حیاں کرنا چاہیے تھا ناں، اگر اس کی نیت میں کوئی خور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔" مجھے ایک غلام کی باتوں میں بس آنا چاہیے تھا۔ "سبلی روتے ہوئے گڑ گڑائی، "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، یہ بہی زاد نے پے در پے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے ہٹا دیا۔ میری ہم دردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بے نکات کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں میں آپ کے ہاتھ تکی تھا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچا نا چاہتا ہوگا۔ تب ہی مجھے میرا کیسے گھر سے نکلنے پر کسنا تار۔" چھا ہوا آپ کوک ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔ "میں حیرت سے گلے اور اپنی جگہ جھک سبلی کی یہ ساری شرافت مستحارہ۔ بہرور دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی "تمہیں میری ہاتھوں میں گڑ گئی۔" تم بتاؤ یہی راہ۔" کیا سبلی ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جو بے دیے سے قبل اتنا ضرور سوچ بیٹا کہ بہرور کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔" میں نے ایک بل کے لیے غرغرا کر سبلی کی طرف دیکھا۔ وہ لا تعلق سی کھڑی تھی۔ بہرور دوسری بار دروازے کھلایا۔ "جواب دو، کسے کیا یہ سچ ہے؟" میں نے سر اٹھکا یا "جی ہاں، مائکس جو کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی نہیں جانتا کہ گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔" ایک لمحے کے لیے سبلی کی ہاتھوں میں بے یقینی کی ایک چمک برائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو تامل کر لیا۔ بہرور کریم نے سرسراہٹ آواز میں مجھ سے پوچھا، "کوئی آخری جو جی ہو تو بتاؤ، تمہاری گفتی کی چند سانس باقی رو گئی ہیں۔" میں نے بہرور کی طرف دیکھا، "جی ہاں، ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارے کے بعد میرا چہرہ مسخ کر دیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے جیسے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔" بہرور کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار پے سے عینے سے نڈیا۔ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ جانتے ہوئے میری برابری



کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، ٹھیک اس لمحے، جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر بے باک کر لیا۔ پدی راؤ! تمہا کیا بہت کم کیا تم نے۔" بہرور پٹلا در در سے چلا۔ "اسے آؤ فیروز خان! بہرور کی آؤ اس ویراں تہہ خاے کی پارکنگ میں گھونٹ کر دو گئی۔" اس دور مجھے پہلی بار احساس ہو کہ بلی خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی، کیوں کہ یہ پارکنگ تقریباً متروک ہو چکی تھی اور پارکنگ ڈاے اب چھت پر ہی نئی پارکنگ استعمال کرتے تھے۔ لہذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس بے بسی کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی، تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مگر آج وہی دیرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں چارے لیے وہاں جاں بن گئی تھی۔ بہرور کے چلے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو کھانوں کی دھڑ سے ایک خوب صورت اور چمکدار سے نو جوان کوختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر شپ پیٹے ایک چاب سے سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا، کیوں کہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر بلی کے جسم سے تو جیسے جون کا آثری قہر بھی نکل گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں دور سے چلائی "نہیں! غائب! اس میں دید کا کوئی تصور نہیں بخش دیں اسے۔" بلی دوڑتی ہوئی آئی اور بہرور کے قدموں سے پٹ گئی۔ بہرور نے کسی ان دیکھی ریت کے احساس سے، اپنی ہاتھیں دور سے بچتی ہیں اور میرے سے ہوا بڑبڑا، جیسے خود کو گالی کر رہا ہو۔ "کیوں چاب! غائب! کیوں! کس چیز کی کی تھی تمہیں! کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، پیش، آرام، دوست، چاند اور رتبہ، عزت! آخر کس چیز کی کی تھی میرے پاس تمہیں؟" بلی روقطار رو رہی تھی اور وہ جی تو جواں بہرور کے کھانوں کے شکم میں تڑپ رہا تھا۔ بہرور نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ "یہ وہی ہے ناں، تمہارا اساجہ شگیتر ستوں و لا، ولید! بلی تڑپ کر کے بڑبڑا۔ "ہاں آغا! یہ وہی ہے، اسے میری محبت یہاں کھینچ لائی۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ یہ میں جتنی بھی محبت کبھی بھی نہیں پائی، معاف کر دیں ہم دونوں کو۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ کم، کم سے جاتے دیں۔" بہرور نے کرب سے اپنی منہیاں سمجھتی ہیں۔ رقیب کو سامنے رعدہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک، اپنے محبوب کی زبان سے اس کی تعریف سنا ہوتا ہے۔ بہرور نے بلی کی طرف دیکھا۔ "واہ رے عورت! واہ، ساری کائنات کے سر پرست رار یک چاب اور تیرے من کا گورکھ دھدا ایک طرف۔ تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔" بہرور ایک جھکے سے فیروز کی طرف مڑا۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز جاں! ہمارے چچے کچھ جکڑ چل رہا ہے۔ سب دیکھ یا اپنی آنکھوں سے؟" فیروز خان نے سر جھکا دیا۔ سب مجھے بہرور کی منصوبہ بندی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس سے جاں بوجھ کر مجھے بلی کی مگر لی پر دکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بلی صبا میری مگرانی میں غیر محتاط ہو جانے لگی۔ اس کی سانس گروا سے دن جزیرے پر جاے کا پروگرام بھی ساری ذرا سے باری تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے بلی کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس بلی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سب تم سے بہرور نے بہت تپ تول کر پئے تھے۔ ساری سادہ ہی بہرور کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور سب باری بھی اسی کے ہاتھ تھی۔ بہرور نے کوئی کھولی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف

دیکھا۔ "مجھے بلی صبا بہت پیاری ہے فیروز! بہت نوٹ کر محبت کی ہے میں نے اس سے۔" دھیان رہے اسے حیرت سے وقت، زیادہ تکلیف نہ ہو اور ولید چون کہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہرور کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام بچے خشکے عاشقوں کی طرح مارا گیا، تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ بے جا ڈان دھواں کو! بلی در در سے چلائی۔ "نہیں آغا! نہیں! فیروز نے کھانوں کو اشارہ کیا، انہوں نے لڑکے اور بلی کو لے جانے کے لیے کھینچا۔ بہرور دھیرے سے بڑبڑایا۔ "عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ جان کا صدقہ لیے نا کہاں ملتا ہے! اب مجھ سے خبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہرور کی طرف بھاگا۔" انہیں معاف کر دیں نا لک! اس کا قصور بہت بڑا ہے، مگر آپ رحم کریں۔" میری بات پوری ہوئے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خود کار مشین گن کا دست پوری قوت کے ساتھ لگرایا اور میرا بس اندھیروں میں ڈوب گیا۔ گرے سے پہلے میں نے تہہ خاے کے کسی کو لے سے دوغادر کی تو دیکھی۔ اور اس سے زیادہ بلند بلی کی کرب ناک چنچ تھی پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے تھاگ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنس دان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب سانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) ختم جائے تو سے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور روح نکل جانے کے بعد سانس کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں۔ جاے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ میں کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا، مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ صرور بہرور نے اس دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور سب میں کمرے میں نہیں، کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہرور نے۔ زندگی کے کسی امتحان میں بھی تو پورا نہیں ترپا دیا تھا میں۔ چلو، جو ہو، اچھا ہو۔ قصہ تمام ہوا! شجروں تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے۔ خود اپنے سائے میں چل کر سڑک تمام کیا مگر ہیر سڑک بھی کچھ ہاتی تھا شاید! اچانک کمرے میں تیر روشنی ہو گئی اور کسی دھیرے سے میرا نام پکارا۔ "پدی راؤ! ہوش میں آؤ، کارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

(جاری ہے)





ٹوٹ کر نکل رہی تھی "تو پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ سے میرا جرم بھی تو کچھ نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مارا دینے " بہرورد ب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "ہاں، تمہیں بھی مار دینا ہی وقت۔ اس تمہاری آخری حوصلے سے ہاتھ روک دیا میر۔ کیوں خود سے اتنی عزت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوزنڈل کا اس طے کی عمر، میاں ہیں۔ مرد دوست، اختیار، طاقت اور بے سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجہ است و غیرہ فکری ستاروں کی ضرورت ہے۔ پسوں کے شہر اسے صرف نافذ میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے گئیں زیادہ کثرت ہے پڑی را۔" میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے اپنی ہی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر چاٹک ہی بہرورد کو کچھ یاد آ گیا۔ "ہاں، مگر تمہیں جو انگلی کا تاشوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جاں کے ور ہے اور سارے اثر تمہارے سزااں کراہی "کی قہر تمہارے جسے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے بے جھوٹ بولا، کیوں۔۔۔۔۔؟" اس لیے کہ میں آپ کے ڈوکروں اور دیگر حملے کے سامنے آپ کے گھری عزت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سلی مالک سے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی سبکی یا رشتے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تہائی سے گھبرا کر۔ درمیں کبھی آپ سے نہ بچتا تھا۔ "بہرورد نے ایک گہری سانس لی۔" میں جانتا ہوں، اس کے بے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہر حال تم نے اپنی مدد کے بڑے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری رائے "ج" سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملنے جانا اور ہاں سب تم انگلی ہی میں رہو گے۔" بہرورد کے کمرے سے نکل کر میں انگلی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آرامتہ دفتر میں کچھ یاد۔ "یہ "ج" سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں شہر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھ عہدہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کبھی کا دفتر ہے اور یہ سارا عہدہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔" میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر کچھ سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا "تم بہت جدبائی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک و ملا داروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کبھی کا کام دیکھنا ہوگا، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جدبائیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا کھینچا کھڑا کر دے، لہذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے منصوبہ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ ویسے بھی دی کی پولیس سب چومیں گئے، ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قاتلوں سب کے لیے ایک ساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔" فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا عالی شان دفتر اور بلائی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا یہی رات "ج" دعویٰ کی سب سے بڑی تعمیراتی کبھی کا منبر تھا۔ میں نے کرسی کی بے رخ سٹاپ پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر کش چار مرتبہ سے تمک کہہ رہا ہوں منزل پر واقع اپنے دفتر کی بی بی کی شمشے کی کھڑکیوں سے دعویٰ شہر کی گہرا کبھی کا نظارہ کیا۔ اس دور میں مجھ پر ایک در صدیوں پر ہمارے بھی مشکلف ہوا کہ ان اوپن آسمان سے باتیں کرتی عورتوں کے کرداروں میں بیٹھے وگوں کو میں پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے حقیر اور کٹھن کے کوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن راتیں چاٹک ہی بتاتا ہے کسی کام سے دعویٰ آ گیا، اور عیسے سے پوچھنے پوچھنے فیکٹری کے دفتر تک پہنچا۔ مجھے میز کی کرسی پر بیٹھ دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چڑا ہی سے چائے یا کافی، نے کے لیے کہا اور راتیں کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بیٹھا دیا۔ "اب کچھ کہو گے بھی یا اس کی کم کم بیٹھے رہو گے؟" راتیں نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے اندر لیا۔ "پڑی رہی رہے۔ کچھ بتاؤ، تم کوئی پسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور ہائی کیا کو بتائیں سکتے۔" میں نے گہری سانس بھری "نہیں، میں اب کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش "ئے۔" مگر میرے جواب سے راتیں کی تنگی نہیں ہوئی۔ "دیکھو پڑی را، میں جانتا ہوں کہ بہرورد مالک کے ہاں اب بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو کسی ایسی گرد میں لکھا بیٹھے ہو، تو بھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دعویٰ سے پار کر دے سکتا ہوں، ایک دو دوست ہیں میرے، "ج" والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہوگی۔" میں نے مسکرا کر پچھ اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ "مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ بلا خود مجھے اپنے آپ سے فرار کرو سکتے ہو؟" ہے کوئی ایسی، "ج" بحری جہاز یا زن کھولا، جو مجھے خود میری ذات کے جوہر سے فرار کرنے میں مدد کر سکے؟" راتیں کی چٹکیں ہم ہو گئیں اور پھر وہ ریا دور دیر وہاں بیٹھیں سکا۔

میرے دن اور رات پھر سے اسی یکسانیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بہرورد جاتا تھا، رات بچا لو سے دعویٰ تھی ہو چکی تھی۔ علی کی موت کے بعد، ہاتھ نے نکل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی ڈھنسیں کھینچنا خوب جانتی تھیں۔ بہرورد کریم بھی اب لیا اور گہری پر جاتا تھا، خاموش، کھو یا کھو یا، اسرارہ۔ اس شام میں ایک مردوری حائل پر اس کے دستخط لیے اس کے پاس پہنچا تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟" ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھنا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں مدد سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔ "بہرورد شام کے جہاز سے لندن لڑائی "گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مدد و مدد کی اپنے حدا کو بھی تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دس سے منا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدور انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا صرف یادیں بھلانے کا اختیار کر دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہرورد ریا دور دیر نہیں بتا سکا اور ٹھیک روٹنے کے بعد وہاں آ گیا۔ مگر اس کی، اپنی ہی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں بتا چلا۔ جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس ڈاک لا جو اس، "مید کا پانچا" اور سورج وال ہے اور وہ بہت جلد دعویٰ پہنچ کر سلی صاف اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی مدد سے سے تفتیش شروع کر دیا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہرورد کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک ہار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہرورد کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہرورد نے ہم سب کو نکل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پھر سکوں لکھ میں بتایا کہ دعویٰ پولیس سے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈر ہمارے جس کی ضمانت ہو چکی تھی سے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لہذا اس کے دعویٰ عملے کو "ج" کے بعد کھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں لکھنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آسمان کے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دعویٰ پولیس بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہرورد کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی کھاڑا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہرورد تمام تناظر ہاتھ کر سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں رہے۔ باقی تمام سرگرمیوں کے حسب توقع جانے سے پہلے ہوا آخری عہد بہرورد کو سزا دیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر نہیں چائیں گے، چاہے انتقام پانچ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے درگزر بہت جلد کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جانے کی روزانہ بند کیا اور پریشانی سے بولا: "ہم سب بھینس رہیں گے، مگر آپ کو خوراک یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت دیا کستان کی بھرتہ رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا رہا ہوں۔ سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کئی بھینس، دوڑتوں کے بعد آپ کی محفوظ مقام پر ہوں گے۔"

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی چوری بات سنی: "بھینس کبھی زور پوٹی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے، فیروز جان۔ تمہاری راہ کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔"

اس کے ہاتھ اچھی صاف ہیں۔ میں کہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھریا جائے۔ "بہروز کریم کا لہجہ حتی تھا۔ فیروز، ایسے مساواں سے چٹ گیا۔ میں نے بھی دافنی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی "ورگوٹھی۔" جب کوچ کا وقت آئے تو ضد مت کرنا، چلے جانا۔" میں نے پٹ کر جواب دیا: "آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قافلوں میں مقروض سے بھی بڑی سروس دے رہے ہیں۔" بہروز نے سگار کا ایک ساسا کش کیا اور ایک چمک میری جانب بڑھا دیا۔ "میں رکھ لو، رے وقت میں کام آئے گا۔" اور میری ایک ہات میں ہمیشہ یاد رکھنا، آپے آپ کو تاحقہ مت جانو، یہ ہمارے ہونے کو حریفہ، راتی سے، مگر جو سینہ اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے دکھائے، "کسی کو سلام کرتی ہے۔" یا کو لکھنا یا لکھ لو، یہ رات۔ محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دس کے بھلانے کو یہ ایک نقد تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود سے اپنے ہاتھوں سے کھود پڑے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے، کٹر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش، تمہاری طرح میں بھی عمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "کبھی کسی کو کھل جانا نہیں ملتا۔"

پہلی صبح کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد لٹک رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دھنی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے ارد گرد راستوں کی گہرائی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حقیقی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی۔ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تمہیں دس بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی، چھپ میں بنکا کہ کسی اور جواب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر لکھا فیصلہ بڑھ کر بہروز مجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز جان کو یہی معاملہ کی ٹھیکسی کا مددہ اور ان سے غائب کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے طرہ واری راستہ ہی محل میں بہروز کی ساس گرہ کا جیش اور پارٹی منعقد کر کے کاڑھونگ رچایا اور شیر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو مدھر اُچھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہوے وہاں ہوگی، فیروز جان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑے گا، جب تک میں اور دیگر مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دس شام ہی سے محل میں جلی چلنے لگی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ بہروز کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک بیٹھ کی آزمائی ہوئی ترتیب تجویز کی۔

فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، یہ جو بھی ٹھیک لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید مشکل نہ ہو۔"

بہروز بھی اپنی خوب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ذریعہ بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا، اور گھر سے نکلتے ہوئے لانچ میں پہلے بہروز کے سگار کس سے ایک سگار اٹھالیا۔ اُچھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار نکل سے باہر نکلے تو میں ایسے راویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار سے پھنسی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا نہیں چارہ ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دروازوں سے بھی کھٹ سے سلام بڑا دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی شیوار، وقایع کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھوے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے گل سے لپکتے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی پردی جیب ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا ہمارا طریقہ شاید بھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ذریعہ کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا، اور ہم تین چار گھنٹے تک وہی کی سڑکوں پر دھڑکتے اور بے مقصد کار دوڑتے رہے تعاقب میں آئے وہاں جیب کو ہم نے براہ راست روئے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جاں بھڑانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریز جا سوئی فلموں میں، میں نے ایسے مناظر بار بار دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں بھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی، جس کی اثران وہاں تک پہنچتی ہے، جہاں تک اس جہاں قائم میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ کر لکھ لیتے ہیں، جو کبھی ان کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیل کیا بلا ہے، جو امہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا وجہ کر کے وہاں جیب میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ذرا تیز کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز جان اس سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بے مشکل ان سے معذرت کی کہ، لکھ کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشاءِ تاولی فرما میں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قافلوں نالند کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہروز جان کا یہ بھرم تخری وقت تک پہنچ رہا تھا کہ بہروز ضروری کام فرما کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تہائی اس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے اس پاس موجود سالوں میں ہماری میزوں پر بھی نہیں تہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے ہجوم میں تہا کھڑا، بھٹل برہاست کرنے کے بہانے ذرا غارتا رہا۔ پھر اچانک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائز کا ایک شور مٹا اٹھا۔ چند لمحے بعد دافنی چائیں کا ایک بڑا سر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے منہ سے کہیں زیادہ دکھاتا تھا۔

"تمہارا لک، بہروز کریم کہاں ہے؟" "میں آتے ہی ہوں گے، لک۔" "اس شخص کو عربی لہجہ کی انگریزی میں گرجا۔" ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا درست ہے۔ میں نے سادگی سے جواب دیا: "جب وہ وہاں آئیں تو گرفتار کر لیجئے گا۔" "میں یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھڑک رہا ہوں، چھپنے لگے اور کچھ دیر بعد اس افسر کا تحت باہر سے ہوا گتا ہوا انداز اور اس سے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی بھونٹیں تن گئیں، اور وہ غائب میں میری طرف پڑا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنز یہ مسکراہٹ ابھرائی۔ "میرے پاس تمہارے لیے ایک۔" کی خبر ہے۔"



بائیں دھیم دھولوں میں سے پسندیدہ صوفیہ اور ماسٹنگ میں سے، "جد اور محبت" اور "بچپن" کے بارے میں  
 "اقوامی پریم" حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد نے ٹیکس میں شامی کوئے کے نام "میدانہ" بھی وقت کے پسندیدہ ترین نام کا یہ حاصل ہوا۔ سب  
 ان کی خدمات پر حکومت پاکستان نے اعزاز کا "آئی سٹور" یہ نمونے نقشے میں میدانہ نامی پریم ہیں "اقوامی فلم" غنیش کا جی شیش  
 سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

پولر: یہ چھتہ حساس، قدرے مشکل مصروفیت پر مبنی ہے۔ یہ ایک بے نقص کی تحفہ جسے ممبروں کی  
 عیب کے سبب اس کا ہر پتہ، ذر پرست دنیا کے، ان گنت بد صورت رویوں، بد ہنس آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا  
 ہرگز صحت مند نہیں ہے۔ ہمارا چاہیے پرانا ہے۔

ایڈیٹر: سید سید علی شاہ، نائب جنرل، اخبار "سب" کی چھتہ "سب" جی۔ این۔ این  
 sundaymagazine@anggroup.com.pk

میرا دل رور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا، میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک  
 اور دیگر ساتھی پیسے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ لی خاں، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔" کبھی کبھی ہمارے حادثات  
 حقیقت کا روپ دھارے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے، شاید ہمارے اندر بھرتے خوف اور دھم کا تقدیر و پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ  
 راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے، ایک آپ بیتی، گہرا تو میں نے بے حد شگفتگی کے میں مطابق بہرہ ور کر دیا۔ فیروزہ اور دیگر عملی کو تلف  
 چھوٹے چھوٹے حوالہ میں مکرر میں بد پایا۔ بہرہ ور کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکام کے ساتھ بحث کرتی نظر آتی۔ مجھے بھی  
 ایک مالک میں جھک دیا گیا، درمیان میں اس سے دوپہر کے ساتھ ایک لگا کر بیٹھ گیا۔ سناٹ کی ساری بے چینی اور بے قراری اسی وقت تک ہوتی  
 ہے جب تک تمہارا اس کے ہاتھ رہتا ہے، جب یصلوں کے کنارے دوسرے ہو جائیں تو پھر ک ان چانا سائلوں اور ٹھہراؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی  
 سمیٹ دیتا ہے۔ میرے بعد بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھے، پھر مجھے بھلا کا ہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک  
 چھوٹے سے ہال میں کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہرہ ور کریم کے چہرے پر حسب معمول شکوہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے سے مسکرایا۔ "کہو بی بی راد، امید کی  
 رہی؟" کہتے ہیں مشکلات سے دور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے ہٹا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، مگر یہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی  
 ہوتی ہے۔ بہرہ ور کے وکلاء نے بڑی چوٹی کا رور لگا یا مگر اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب ایک آپ میں سنا نا چھا گیا، تو  
 میں نے ساتھ وائے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی، "آپ سو تو نہیں گئے مالک۔" "کچھ دیر بعد بہرہ ور کی "ڈور کوٹھی" کسی سوتے ہوئے  
 سے یہ بڑا عجیب سا ہوتا ہے؟" میں نے ایک گہری سانس لی، "مذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے بعد کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے  
 مالک کے قتل کا اعتراف کر کے جرم اپنے سر سے ہوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو میری ہوگی۔" بہرہ ور نے کچھ دیر توقف  
 کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری، "بہرہ ور کریم نکلی ہو چکا ہوتا ہے، جتنا وہ ڈھمکتا ہے، تمہارے اس احساس کا جو جھمکتا ہے، یہ نہ ہی راد، اور ویسے  
 بھی ولید کا پاپاں کی بیٹی سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت نے کرتا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت  
 جلد جج کی قہر تک پہنچ کر اے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا۔ میں نے زندگی میں بہت ختم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رشتی کو تنگ ہونا ہی تھا۔ تم  
 اطمینان سے سو جاؤ، مجھے ابھی بہت چاہنا ہے۔" پھر شاید پوری رات میں اور بہرہ ور اپنی اپنی آہی کو خرواروں میں ساری رات جاگتے رہے۔ ظاہر نام  
 دہوں ہی قیدی تھے، لیکن انہوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھری ممتیں سمیٹ کر اس حقارت خانہ میں پہنچا تھا اور شاید  
 ہی اس کی کوئی حسرت ہوتی ہو، جب کہ دوسرے دو بد نصیب تھا، جس کی زندگی ہی عمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی، کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دیا  
 میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا عربی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچی سستی میں جنم لینے والے دو بچوں میں کیسے توازن رکھتی  
 ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب پر برکسے تو بے چارے ہیں، چاہے وہ دہاویں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی توجہ ہوگی۔ کوئی تو صلہ  
 یا عام ملے کر رکھا ہو گا اور وائے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی عمر دہیوں کا حساب براہ کیا جائے گا یا پھر سے بھی تقدیر کا کچھ سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہوئے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ  
 گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جس کا اس کی بھرماتہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، ولید انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب گم غم کھڑے  
 بہرہ ور کریم کا بیاں سننے رہے۔ اس نے بے حیاں میں بے ہر جرم کا مرکز کی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروزہ بے مالک کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر  
 رو پڑا۔ ہم کبھی کی پلٹیں ہم نہیں۔ بہرہ ور کریم کا بیاں کسی رندہ اس سال کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں زندگی کا یہی نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، "یہ  
 یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے ہیٹا شروع کرتے ہیں، لیکن بہرہ ور کے بیاں کے بعد مجھے، حساس ہوا کہ اس نے زندگی کو کتنی بھر کے جی لیا ہے، تاکہ اب وہ  
 اس تمام سے اوب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں رندہ و کبھی ایک ہی زندگی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں، تو پھر ہم کسی  
 بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناپتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں پھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی  
 نے بہرہ ور کو موت کی سرانجام دی۔ فیروزہ حال کو بھی اس کی معاونت کے جرم میں زندگی کی قہر کی مٹھی چھو کر عمر قید ہوئی اور کچھ سمیٹ کچھ دوسرے ہاتھوں  
 شادوں کی بنیاد پر رہا کر دینے لگے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جولائی ہو، مارچ ہاں تو انصاف ہی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف میں جاتا ہے۔  
 بہرہ ور کریم نے اپنی ساری دولت، جائیداد اور اثاثوں کو دھڑکھڑکاتے ہوئے تقسیم کر کے "دھانسنہ" پٹی بیوی اور بچوں میں بانٹ دیا اور وہاں پہے تمام بچے چائے  
 والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلاں ادارے بھی جیٹ کے سپرے کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر ہتمام کر دیے،  
 جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جس کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ نظام بہت ہی ہوتا ہے۔ بہرہ ور کریم  
 گرام تھا تو خواتین کا یہ معیار اس کے شایان شاہ تھا، شاید چھوٹے سے چھوٹا دروازے سے بڑا گناہ کا بھی کہیں نہ کہیں بے اعمال کا درس برہرہ کھنے کی

شہد جو جوش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، مگر سر اور جگر کا یہ نظام خود بخود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ میں بہرور کریم کے اٹاٹوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے گل میں پڑا ہوا بڑا ایلا میر سے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک لمبی ٹوٹ میں تحریر تھا کہ چوں کہ اس بیٹا کو دار بہت زیادہ ہے اور بہرور کو شہ شہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ بیٹا تو گل سے کہیں منتقل کیے جاے کی صورت میں اپنی اصل شکل و ہنست کھوٹے سے ولید وہ جائداد جہاں وہ بیٹا تو پڑا ہوا ہے تمام تر گل اور نیکی سمیت ہدیہ اور کے نام کی جاتی ہے۔ بہرور جاتے جاتے ہم سب کے نام کا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات لکھوں کے لیے کافی تھا۔ اس سے اپنے تمام ارادوں میں کام کرے والے اگلی سے اگلی امر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چڑھی ایک کویر اور پاشا تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کا رکن اس سے آخری بار مل کر واپس لوٹ رہے تھے تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے تو بہرور سے میری طرف دیکھا۔ "تم مجھ سے نہیں ملو گے یہی راد" مجھ سے رہائیں گیا اور میں تمام ادب و ادب ہارنے حلق رکھ کر روئے تو اس کے گلے لگ گیا وہ پھر مجھے سہاتے ہوئے بہرور بھی رو پڑا۔ اس آہنی ورفوں دی، خود و اعصاب کے آدی کوئیں سے پہلی ہارم تکبیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے کیوں کیا آپ سے ایسا؟ کیوں خود کو موت کے من میں جھونک دیا، آپ کے دکاء اور قانونی مشیر، اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سر کو کم رقم عرق میں تبدیل کر دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ سے اپنے لیے خود تجویز کی ہے، قاضی سے تو اس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔" بہرور سے سر اٹھا دیا "شہ میں سٹی کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا یہی راد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیکھ کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ حساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سر اس سے تجویز نہیں کی کہ میں نے سے مار کیوں ڈال بلکہ میں سے خود کو یہ سر اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے حساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری وہی ٹانگیں ہے مگر یہ رات تب کھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ تب میں سے جانا کہ میں بھی اب اس کے بنائی نہیں پاؤں گا مگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ وہ بہرور نے "جنگ ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔" اس سے مجھے آخری مرتبہ کچھ کر گئے لگایا "ہا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہونم مگر ت چائے کیوں خود کو تارواں کر رکھا ہے۔" میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہرور سے رحمت ہونا رہا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر چاہی میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ وہی پر میں فیروز خاں کی کوٹھری کے پاس رک گیا، وہ آہٹ میں کر سناخوں کے قریب آ گیا۔ میں

سے ہم پلکوں سے اس کا استقبال کیا "جارے ہو میرور؟" وہ "کھ سے مسکریا ایک۔ ایک دن تو جانا ہی تھا۔" لنگ کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے، میں سے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے، ان سے پہلے موت کے تھات تار دیا جائے، دور۔ میں اوپر جا کر حد کو کیا مت رکھا دیں گا۔۔۔؟" میں نے میرور کا کاندھا تھپتھپایا "تم سے بڑھ کر وہ قاداری اس دنیا میں بعد کسی اور نے کیا بھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جس میں تم میرا تھا کسی آسے کے بغیر چھوڑے جارہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا و وفادار دوست؟" فیروز مسکریا "پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خاں، ضرورت پڑے تو سے پہنچے پاس بلا دینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ یہی راد مجھے، اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری عہد ہی دن کام آجائے، دور۔ غرقوس، نیگاں گی۔" میں آنکھوں میں "سو سے بڑھ چھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

بہرور اور اس کے وفادار فیروز کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفنایا گیا، جہاں انہوں سے عروغ کی آخری منزل سر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ روال پر یہ ہو گئے، بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوت گوئی بھی سب کر چکی ہے۔ میں گھٹنوں پر سے مال میں گم ضم میں اس پر سے پیا نو کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی سٹی میں بیٹھ کر رہا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پانوں کے سروں پر ثبت ہوں گے۔ میر جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشاں مٹا دوں۔ پھر ایک شام، رات تھا وہ بس گئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سونگلی ماں کے ہڈ سے کے لیے انگلیڈنگی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے رات کو پھر سے کام پر رکھ دیا اور اس سے انیسویں میں شفٹ ہو جائے کی درخواست بھی کی۔ جائے کیوں وہ مجھے اس محل در لیل ماب کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفتی کو بھی میں سے دوبارہ وہی دہلی بولایا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کرنی "نہیں یاد ہے یہاں پڑو ہی جتا ہے،" لنگ یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔" میں جانتا تھا کہ اس کا جواب بھی ہوگا۔ ٹھیک ہے، مگر ایک شرط نہیں میری بھی، مانی ہوگی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دس سے پناہ دوست نہیں مانا۔" کیسی شرط؟ "میں نے دراز سے یک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔" تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت چھاپا کستان ریٹورٹ تھوٹا چتے تھے ناں، یہ تہارے رٹورٹ کی چابی ہے۔" رفتی کچھ دہک دہک دہلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس سے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگایا "تو صرف نام ہی کا نہیں، دس کا بھی ہدیہ رہے۔" بہرور کے جائے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے، امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دوست ایک یہ مٹا طیس ہے، جو صرف دولت کے لالچے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہرور کے شروع کیے گئے ار جوں مضروب جو میرے حصے آئے تھے، وہ جیسا کھینچنے کے کچھ پیسے ہی مٹا طیس تھے، میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے بھیر کی ہتالی ہوئی آنکھوں میں پیسے لگاؤں اور پھر ہمتوں بیٹھ کر اس سے حاصل ہونے والا منافع منسٹار ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں، ستارستان کے دستا پ پروں کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ پھر شاید اس امیر کو بیٹھ کر یوں دوست گنا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیس میں اس جمع تفریق کے نہیں سے چند بیہوشی میں اتنا لے لگا۔ دولت مند کو دوست خرق کرے کا حقیقہ نا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دوست اس کے لیے سرور رہنے لگتی ہے۔ میرے بھیر مجھے دروازہ پیرا کدے کے مت نے کرتا تے اور پھر جب ان کے مصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں اس کی دانی عرق ریزی کے نتیجے پ بہت کتاہٹ سے سنتا تھا۔ ان ہی دنوں انہیں کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارے سینڈر منظور کر لیا۔ میں سو سے بہت کتر، اتنا اور حتی لامکان کوشش میں ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں چانا نہ پڑے۔ مگر اس بار کچھ ایسی صورت حال ہی کہ مجھے بار سلوٹا جانا ہی پڑا۔ یہ جیسا بڑے کہاں کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز اکھاڑ دینے والے، نساوں کو بل بھر میں در جوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری ثلاثت کا فکرت عیسے بے ہر نس گیر بکنو کاس میں سب سے اونچی تقسیم کا لک کر دیا تھا، بعد کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس در اونچے درجے کے دکھائی دیے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا اعلیٰ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جائے کیوں پنے کانٹ کے دروت پر چلنے والی سبک پاشی، جس کے پائوں پر ٹپکتے ہوئے میں نے کانٹ تک ان گھٹ مٹر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے لیے نہیں ہوتے تھے، اور کتاہٹ ترس کھا کر چند سٹوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکے ہی کی جارت دیتا تھا۔



انہیں کے جس سات ستارہ ہوئی میں میرا قیام تھا۔ اس کے صدارتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دور سعید پتھر اور لکڑی سے بنا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑ دکھائی دیتا تھا۔ میرے ہیرا پلوں نے آگلی شام معاہدہ طے ہو جانے کی خوشی میں مجھے اسی اکھاڑے میں بھینسنے کی سنان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر دیا۔ اس میں نہیں جانا پاتا تھا، مگر میزبان بہت عمدتے کہ کوئی تین تین اور بہت کم تین تین دیکھے تو اسے کمر ہاں لوت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا جانتا تھا کہ مجھے تو دنیا کے سبھی بڑے شہر ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بڑا گول، وہی انسانی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرتا، مگر یہ شہر باقی بڑے شہروں سے کچھ خفہ دکھائی دے رہا تھا، مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے انہیں میں آنے والا تیرہ بیٹن سے کمرانے پر لی گئی الف لیلٰی کی کہانیاں یاد آئے لگیں۔ وہی محرمیں، وہی ستونوں کی قوس قزح، اندرون شہر اینٹوں کی کئی گھیاں اور رستے، نئی تعمیر کا شاہکار، الف لیلٰی کی گہری اور رستے۔ مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہو گئے۔ دین کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کچھ کچھ قماشائیں سے بھر ہوا تھا۔ انسان صدا کا جیسی ہے اور سے یہ وحشت بھرے قماشے دیکھنے میں بیٹھ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہیل فائننگ کے سوٹ پر سرخ جیکٹ اور سر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سرخ چادر پہنا، ہسپا بوی ٹیل فائزر اکھاڑے میں داخل ہو تو قماشائیوں سے تالیوں اور بیٹوں سے "سناں سر پر دھنا ہوا۔ کنواری لڑکیوں نے اس کو چہرہ لڑکے پر پھولوں کی ہار لٹ کر دی۔ گھریل فائزر نے صرف ایک گلاب تھا کہ اس سے اپنے ہونٹوں سے لگایا جو اس کی محبوبہ سے اس پر پھینکا تھا۔ میرا حواس میرا ہاں مجھے یہ ساری روداد کسی رواں تھمرے کی طرح سنار ہوا تھا۔ یہ لڑکا ہمیں کے بہترین ٹیل فائزر میں سے ایک تھا، جسے لوگ انٹو سے نام سے جانتے تھے۔ انٹو آج تک تین کے خانوے جنگلی بھیسوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا پہا ایک سوواں مقابلہ تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سیکڑا بھل کر کے ماریا سے شادی کر لے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں بیل دھرنے کی بھی جگہ تھی۔ دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑے بھیسے بھی آج اپنی سوویں بڑائی منانے جا رہا تھا۔ بونوں نے اس کی دھندلے طاقت کی وجہ سے اس کا نام "گھر" رکھ رکھ چھوڑا تھا اور گھرنے سے بچنا وہ گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی ٹیل فائزر کا جسم چھڑے بنا اسے اکھاڑے سے دھن نہیں جاتے دیتا تھا۔ مگر بچے وقت کے یہ دو بہترین لڑکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مقابلے آ رہے تھے۔ انٹو نے اپنی کنواری چمکتی دھار کو بچھو کر رکھا، اور گھر سے میں بند گھرنے اپنے گھروں سے رشتیلی رمین کو کھڑا دھچکا دھچکا ماریا نے انٹو سے وعدہ کیا تھا کہ اس آخری بھیسے کو زیر کرنے کے بعد وہ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دے گا، کیوں کہ ماریا بچے محبوب کے تو ناختم پر حریف کو کیسے بیٹوں کی کاٹ در زخموں کے نشان نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ انٹو نے اپنی سیاہیل پوشاک کے سہری شبنم سے کیسے اور گھسوں تک لیے مخصوص چھڑے کے جوتوں کے قصبے باندھے اور کنواری ٹوک رمین پر ٹیک کر ایک شان بے تیاری سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا شہرہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ قماشائیوں کی تالیوں، بیٹوں اور شور سے کان پڑی "دھنٹائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا سے بچے سر پر تھے سیاہ جال کے نقاب دے ہیٹ کو دارا سر کا کر انٹو کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا دوسرا سرخ گلاب بھی اس پر چھا کر دیا ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ بلایا اور تعظیم سے سر جھکا کر سلام کیا۔ شاید میں اسے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انٹو اور گھر کے مقابلے پر تھی۔ گھر کی "گھسوں سے کئی بنا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ اب وہ اکھاڑے میں داخل ہوئے کے بعد اپنے سوویں شمار انٹو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑا سرخ کپڑا ہر اسے دیکھ رہا تھا، مگر گھر حتی جنگوں کے بعد ایک بات تو جچی مرتبہ جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جاں سرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تراشے کی عرض سے خوب تھکانے کا اور پھر طحال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی روتا گھسوں کے درمیان مارک چل دے گا۔ اس نے اپنی تیز دھار کو، پوری طرح گھس کر سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، مگر اسے یہ محسوس ہی ہے دشمن کو اپنے نو کیسے بیٹوں میں پر دکر آنا کی جانب مچاں کر اس کے جسم کو اچھڑ کر رکھ دینا ہو گا۔ ٹیل فائننگ دراصل بھیسے اور لڑاکے (ٹیل فائزر) کے درمیان، عصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جھاپنے، عصاب کا بول میں دیکھے، وہی تاریخ بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انٹو نے سرخ چمکی کپڑا پہنا، جنگ شروع ہو گئی۔ گھر کا پہلا درخان گیا اور انٹو سے اپنی کمر سے اس کے جسم پر ایک جھکا لگا کر گھر کے مصبوط جسم پر پڑے درجنوں داغوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ گھر عصب ناک ہو کر پٹا دردور سے بھاگتے ہوئے قریب "کراچا تک پہنچا۔ وہ بدل ہوا۔ اس کے تیز دھار سیٹنگ کی ٹوک سے انٹو کے پہلو میں چنگاریاں کی بھر دیں۔ قماشائیوں کی چیخیں نکلیں انہیں اور مارا گھر کر کھڑی ہو گئی۔ انٹو اور گھر دونوں ہی جان چکے تھے کہ اس کا مقابلہ آج کسی نام حریف سے نہیں۔ انٹو کے ہاتھ میں بکری سرخ چادر اب بھر سے دھیر سے

جھمکتوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں گھر کا جسم انٹو کی کنواری کے چڑکوں سے بھونپا تھا، وہی انٹو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے لڑھکے تھے۔ ماریا جب بچے محبوب کو اس خوب خوار قاعی بھیسے کے جسم سے مس دیتے، کھیتی لوں کے حلق سے بے اختیار رنج بلند ہو جاتی۔ اس سے چلا کر انٹو سے کہا "انٹو اس کر دو، میرے فائزر، یہ دیکھ گئی ہے۔ مقابلہ ختم کر دو۔" مگر انٹو نے مسک کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر ہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا شہرہ تھا کہ وہ بھیسے کی "گھسوں کے درمیان کنواری گھپنے کے لیے تیار ہے۔ مگر اس نے خود کو بھی گھر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تاکہ بھیسے ساری احتیاط بعد کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انٹو موقع ملنے ہی سے ختم کر دے، قماشائیوں کا شور اور چیخیں آہاں تک بلند ہو رہی تھیں، دور وہ سب انٹو کو اس دیو گئی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انٹو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر وہیں پلٹا نہیں چاہتا تھا۔ گھر سے پٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا، وہ چند لمحے رکت کر دونوں ایک دوسرے کی "گھسوں میں پہنچیں لڑ کر نوتے رہے اور پھر گھر غرنا اور مد سے جھگ۔ بہانا انٹو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انٹو نے بچے جسم کو ایک حواس انداز میں کڑ کر کنواری کا دست مصبوطی سے اپنے ہونٹوں سے دھس دیا، انہیں ہاتھ میں قہم ہوا۔ گھر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حمدان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہوئے والا ہے۔ وہ ایک انجانی دہن جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے یہاں گئے بھاگتے بچے جسم کو اچانک ایک جھکا دی، تاکہ اپنے سر کی جانب ہلکتی کنواری ٹوک سے بچ سکے، مگر کنواری دستے تک اس کے سر میں اترا چکی تھی۔ خود انٹو بھی گھر کے ٹٹوں ورنی جسم کی درد دیکھنے سے کئی لمٹ ہوا میں چھلا اور جب وہ رمین کی طرف گرا ہوا تو گھر کے نو کیسے سیٹنگ اس کے کرتے جسم کا انکار کر رہے تھے۔ انٹو کے جسم میں گھر نے اپنے سیٹنگ چاؤئے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی رشتیلی رمین پر گھر نے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے "گھسوں بد ہونے سے پہلے بچے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا "بہت خوب۔ تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن۔" ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے بھرئی اور وہیں گر کر بے سندھ ہو گئی۔ سارے مجھے کو جیسے سانپ سونگ گیا۔ گورنمن رو پڑیں۔ اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں گھر اور انٹو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ قماشائی ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہی لمحے کسی نے میرے کان سے بچے ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے قماشے میں اتنا تھا کہ کئی طرح چونک گیا، یہ وہی شخص تھا جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ دسر راند اس میں مسکرایا "بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار آج پکڑے ہی گئے۔"



ہاشم دریم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و مشہور امارا کٹر، ناول نگار ہیں۔ اس نے "آقا" حمد در محمد اور انہیں کا سر سے شہ  
الاقویٰ پر لکھی حاصل کی، جو جنگ سے لڑنے میں شامی ہوئے۔ ناول "عبداللہ" کو بھی وقت نے پسندیدہ قرار دیا۔ یہ ناول حاصل ہوا۔ انہیں  
رہا اس جد مات پخصومت پر متاثر ہے۔ انہیں کا سر سے ہوئے۔ یہ فلم کے شے میں عبداللہ، اقی ایف ہیں۔ الاقویٰ فلم کے تخلیق کار شہیت  
ہے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پچی،“ ایک چھوٹے حوالہ دہندہ شکل میں ہونے والی تھی۔ یہ ایک بے شخص کی صفات سے تھی۔ اس کی صورت سے گزرتے ہوئے اس کا ہر پرست دنیا کے آن گت بد صورتوں کی یاد دہانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی طرف سے آگاہ کرنا ہرگز مستحکم نہ تھا۔ اس کی طرف سے آگاہ کرنا ہرگز مستحکم نہ تھا۔

اگرچہ مڈے میٹریں اور مہ جگہ بشعبہ میٹریں، انباروں میں آتا ہے چھوڑ دیا۔ پٹی۔ فی میل

sundaymagazine@anggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا، وہ اور وہی بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہم روہوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ وہ مسکرایا ”ہم دونوں نہیں، صرف میں تمہیں جانتا ہوں۔۔۔ تم بڑی رادہ ہونا، بہرہ کریم کے جاں نثیں۔“ نہیں، میں صرف پری رادہ ہوں۔ بہرہ کا جاں نثیں بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔“ اس سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”لوگ مجھے سینہ برہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شاہ، مسکئی میں رہتا ہوں۔“ میں نے حادیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھئی، ہاں بھئی، بھئی، یہ یہ نام مسکئی نہیں تو بالکل نہیں چچا، جو بات بھئی میں تھی، وہ اس مسکئی میں نہیں۔ چاہے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں ہیں دیتے ہیں۔ کتنی یادیں نچوی ہوتی ہیں۔ ناموں کے ساتھ۔ ب تہا رے، ہرہ کو کوں کل سے چانک نہیں کہہ کر بلانا شروع کر دے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ ”سینہ برہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آ چکا تھا۔ میرے ہیز باب سے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوائی، میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سینہ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آ کر لگ گئی۔“ ”سینہ برہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکال اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔“ میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تہا رادہ، لک بہرہ مجھے ابھی طرح جانتا تھا۔ ہم بڑے پانزرتے، باقی باقی شام کو ہوں گی۔“ ”سینہ ابراہیم مجھے ایک نئی بھس میں جھڑ کر کے چل گیا، شام کو سینہ منگ پول کے کنارے بھی کر سوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مذہب کی بات کی۔“ ہاں بولو، سینہ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟“ ”سینہ، میرے سے مسکرا“ ”تم نے شاید حادیہ سے میرا نہیں سنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بھئی کی فلم انڈسٹری میرے دم سے چلتی ہے، میں رادہ تردنی میں رہتا ہوں۔ یہاں انہیں میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آ رہا تھا، خوش قسمتی سے تم بھی یہیں مل گئے۔ شاید بہرہ سے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کا رویہ کا کا، دھن ہماری فلم انڈسٹری میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پر نارشتہ برقرار ہے۔ کہو، کیا کہتے ہو؟“ ”میں کچھ سمجھ نہیں۔“ ”ابراہیم نے اپنی ٹھکوں پر لگا جیتی دھوپ کا چشمہ اتارا، ہم بھارتی فلموں میں اپنا رویہ لگاتے ہیں، ایک فلم ستر، حتیٰ کہ روزانہ چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو میں پارسو کروڑ لے آتی ہے، ہنٹ بھی حاصل تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشو روں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چت بھی ہماری اور ہنٹ بھی۔ منافع ہو تو ساری دہائے ساٹھ ستھیا من تاتا ہے، نقصان ہو تو ہا، کا، دھن نقصان کے پردے میں بھسپ جاتا ہے۔ بولو، جیسا لگاؤ گئے فلم انڈسٹری میں؟“ ”تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کا ہے یا اسے سعید کرے گا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے نہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سمجھ۔“ ”سینہ ابراہیم، مگر سے مسکرایا۔“ ”جانتا ہوں، تم شاید پچھلے بہرہ کے حامل محاذ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بھئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے غرور مذکور رہا ہے۔ ہم ان کچھ چلیوں کو اپنی انگلیوں پر چاہتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارے چل جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چھ آتے ہیں، اور کوئی سوچ بھی نہیں کہ شاہ رخ، مسلمان، کریہ، یا کتر یہ کسی کے بیٹے، بھائی کی ساں گرہ میں ٹیک کٹا ہے چھ نہیں۔ یا ہمارے حاملہ ان کی کسی شادی میں اہم مسرپیش کرنے کو، کوڑے آئیں یہ سب

ہماری زیر زمین دنیا کی طاقت کے کھرشمے ہیں اور سچ پوچھو، تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا عرصہ آتا ہے۔ اور چوں کہ ہیردر کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عہد ہے، لہذا میں نے ہمارے سبھی کہ جنہیں بھی شہریت کی دعوت دوں۔ آگے بڑھنا ہمارے ہاتھ ہے۔ ویسے تو اتنا یہ دیکھ کر کیوں نہ جے ہو۔ دینی میں بھی ہمیں یہ جنہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سنا ہے، پتہ پاتے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ بے رکھا ہے تم نے؟ ”میں دھیرے سے مسکریا۔ ”شاید یہی جوگ میرا مقدمہ ہے، اور میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلہ طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ایک غلام، اب غلام اور اب مجھ میں کوئی ”خوئے سلطانی“ پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سر پر جھٹی ہے۔ ”میں کھانا اہم

میری بات س کر خجید ہا ہو گیا۔" تے کڑوے ج تنی آساں سے کیسے ہوس لیتے ہو تم ؟ اور میں ے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے بہرور والے محل میں کسی

عورت کا بھی آنا چاہنا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا، اگر یہ سب تہمداری، مددگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے تو پھر تاقیپس بھی کسی کام کا۔ آخر کوئی تو خوش ہوگی تہمداری۔ "میں بچ رہا" سب میں اسے کیا بتاتا کہ میری خوشی ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر درد سے سوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ ہانسی فقیر، طنز، تعادلت اور ترجمہ کے جذبات کے۔ سینٹو بریکم جاتے جاتے چند محوں کے لیے زکا "ابھی نکلے ہو تم مجھے، لالچ نہیں ہے تمہارے اندر، در جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پائے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا ہاں، جیسے ایک ضروری علاج بھی دینی تھی مجھے۔ دینی پوئیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، یہ صرف تم پر بلکہ بہرور کے ہر قسم کی ساتھی پر، اس کی حاضر توجہ ہے آج کل۔ تم اسی لیے پہنچے ہوئے ہو، کیوں کہ الی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہرور کو بھروسے والے نہیں ہیں۔" سینٹو اپرا اہم واپس پلٹ گیا۔

میں دینی ویکس پانچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے، حوالہ کا جائزہ دیا تو مجھے سینٹو اور ایشم کی بات ٹھیک لگی۔ دینی انٹرپورٹ علی سے میری عمرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پہنچا کیا اور پھر صبح وشام آتے جاتے میں نے کچھ خصوصیات چروس اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہوس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک جیپ سی کھلی چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے دو شہر نہیں، کوئی فیدھا۔ ہو، شاید سدا حوں کے پیچھے قہور ہٹا گئے۔ سماں تلے قہور ہٹنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی سب میری ساری ریت اور ہیٹ سے نئی عمارتوں کے صحرا سے اکتاے لگتا تھا، لہذا میں نے اپنے ٹنلک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ ریلوے نے یہ خبر سنی تو "کے بڑا کر مجھے نکلے لگا پایا۔" خوش کرو یا تو ہے پار۔ ہٹا نہیں کیوں مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے محض کا کی لگا رہتا ہے۔ ٹو بھل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر وہیں پہنچا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا شیر یہاں کا نہیں ہے پار۔ چاہے ساری عمر گزریس پھر بھی ایک جہیت اور میریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں پہنے ٹنلک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس ن جاے ہاں سے تو نجات ملے گی۔" میں نے اپنے باقی ایشاف کو جمع کر کے پنی واپسی کا فیصلہ نہایت توجہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کار، بارکوس سمجھاے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مینے میں ایک رو بار چٹو لگا یا کروں گا اور پھر آج کل تو سڑکیاں پید کردی ہیں، سڑکیاں ایجادات نے انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصور اور دور کے درمیان چوبیس گھنٹے رہا ہے۔ محل کے معاملات میں سے ہاتھ کو کیئر لیکر ہٹا کر اس کے حوالے کر دینے اور اس سے "مٹی سے صرف بہرور کا مسیحا پناہو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔"

میرے محلے سے دوڑنے کی جاں نشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے ہوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے بے طور پر آؤر سڑک بھی کر دیا تھا، اور پھر میری رہائی کا دس بھی آگیا۔ میں نے ریلوے کو اپنی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کوئی الی مکاں زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں سے یہ تاکید کرنا محسوس کیا کہ یہی حقیقت وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی رو رکھے اور پھر وہی ہو، جس کا ذرا تھا۔ میرے شہر کے ہونے کی ذمہ کے باہر نظر گاہ میں میرا راجا حاد اس گل و ہتے در پار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، ابھی کہن بھائی اور اس کی دونوں بھابھیاں اور بھابیوں کی ہنسن اور ان کے خاندان کے بزرگ، پور ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑے تھا۔ مجھے وہ دن یاد آگیا، جب میں یہاں سے دینی جاے کے لیے ایک پراے رکشے میں انٹرپورٹ پہنچا تھا۔ اس دن میرے گھر کے گھر تک بھی کوئی مجھے رخصت کرے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کسی کرو نہیں بدلتا ہے۔ یہ جاے کیسے بدل میں بدلتے ہیں۔ یہ دیا کے بدلتے رشتے۔ ساری عمر جنہوں سے بدی راہ پر تنگ باری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پٹیاں چھوڑ کر رہے تھے، آج تو یہ ہے کہ مجھے ان کے برساتے پھروں سے دتی چوٹ نہیں پہنچانی تھی، جتنا لہو لہاں مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سماں بعد واپس ہوا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بھائیوں کو اتار دیا، بھیجا تھا کہ وہ مسیحا آج اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، مہوں کی شایاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپ گھروں میں خوش تھیں، ابھی کی خوشی تھی کہ میں کہ کم پسند دن الی کے گھر پر گراؤں، بھابیوں کی جو نہیں سب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بس تھیں کرتی تھیں اور ہر بھائی کی تقریباً یہی خوش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں انٹرپورٹ ہی پر ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں، خاندان کہ اس مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر رہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر جبر کر کے خود کو اس انتظار کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد غوری نوعیت کی کاروباری مینٹلگ کے لیے جانا ہے اور میں موقع ملنے ہی ان سب کی طرف فرار فراداح صری، یہ ضرور "ذوق" گا۔ میرا پاکستانی عہد، جس کی بھرتی میرے میجر سے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارے شواہد دیکھ رہا تھا۔ انٹرپورٹ کی پارکنگ میں میں سیاہ مسٹرڈین گاڑیوں کا غلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر، اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے رستے درگیاں مجھے اسی طرح خود پر مسکراتے نظر آتے، جیسے میں انہیں سات سماں پہلے مسکا نا چھوڑ گیا تھا۔ جاے ہم پردس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دس میں سب کچھ بد چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتا تھا۔ وہی سڑکیں، وہیں وہیں جن پر میں جانے کتے سارے کج جو تیاں چلی تارہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں پہنچے گھر پہنچا تو مجھے ان انجینی ویروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بدلتا ہر قطر کے بے جاں نظر "ے" ملے یہ درد و یاد بھی پہنچے عدا ایک عجیب سا حساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود وسعت ان کی یہ گفتگوئیں نہیں پاتی۔ شام کو میرے بااے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے متشابه تھا۔ گوہر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر فسرہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر دینے وری سوچ دی۔ وہ شردا ہی میں تھی جڑی ذمے داری پینے سے کچھ بچکا رہا تھا، مگر میرے اصرار پر ہاں گیا۔ میں نے ہی کو پناہ کیوری انچارج بھی مقرر کرو یا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرف وہ بھی ہی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے یہ سہ فخر ہے اپنی جیب سے ایک غیر معمولی ہستول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس ایسے کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہونے آپ کو کسی فکر کا ضرورت

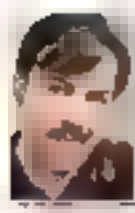


نہیں " میں جانتا تھا کہ کبیر خاں بچا کبہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے "راج کل" کی محافلوں کی ایک فوج بھی رہی، ہر کاروباری مجھے بہرور کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ "جیسے رہیں ہو، بھیس بھی دینا ہی ضروری ہے۔" درندہ یہ سناں، عموماً دوسرے اسباب کو کم تر سمجھتے ہیں اور نہیں کرتا۔" اور میں نے پردیس میں اپنی زندگی کے سترے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ بڑے بھرتی میں سارے شہر کے امر و کوجہ ہو چکی تھی کہ "پی ریڈ" نامی کوئی بہت بڑا صنعت کار شہر میں پنا کار و بار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں، پی ریڈ۔ یہی نام تجویز کیا تھا میرے مہجر سے میری فی کھلی کے لیے، اور جو مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے، اب میں ان کے لیے پی ریڈ نامی ایک بڑا انڈسٹریلسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر نجات مل گئی تھی، جو پرانا نام بتائے میں مجھے ہمیشہ ٹھان پڑتی تھی۔

یہ دولت مند لوگ ہمارے کتنے تباہ ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں ہی میں ہو گیا، جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوت ناموں سے گھیر لیا۔ یہ شام کی پاریاں، رات کی دعوتیں، طلبہ، ہمارے دوست، اپنے "خون" میں کوپے اور گرد و بر وقت اتنا جھوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تھا ہونے کی نشانی نہیں تو در کیا ہے، مگر میں تو ہمیشہ ہی سے ان پڑھوں، گفتگوں سے کتر، تا تھا۔ لوگوں کی تیز سمجھتی نظریں، طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باوجود میں اس تجربے کو ہار ہا نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے جا چیزیں، اور وہ اس لیے بھی پاں پیتے ہیں کہ ہمیں خفا کے سے نظریں نہ چھڑانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف مہجر، کمالی بہت تیز اور چلتا پڑھتا قسم کا بند تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا، مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور سے ٹال دیتا تھا۔

اگلے تھتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم پے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام بھی تک ذاتی "فیس" ہی سے ہوتا تھا، مگر کمالی نے یہاں بھی خاصا عہدہ بھرتی کر لیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی مرحلے کی ادیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پاتا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفاتروں میں اتنی بہت سی حوثیں کیوں بھرتی کر دی جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس منصب "مارک" کی موجودگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔ جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی، جائے کمانے سے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی مینجر نائپ عہدوں پر ان مارک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر دیا۔ میرے استفسار پر وہ مجھ سے سے مسکرایا۔ "ساری بات میں ملاحظت کی ہے، مردہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sense کہتے ہیں۔ ویسے بھی ریسرچ سے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خوشی، مردوں کے شان و بشا۔ کام کرتی ہیں، وہاں کے مرد و عورت زیادہ ڈنٹے واری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ لباس اور اوقات کار کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں ساری۔ اور دفتر کا ماحول بھی خوش گو اور ہوتا ہے۔" میری چاہا کہ میں کمالی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقہ کار پر ہونے والی میگزینوں تحقیقات میں سے صرف ایک ایسی ریسرچ کو نامہ عمل کیوں سمجھا؟ مگر میں چپ رہا۔ دفتر میں کام کرے وہاں خوشی اور ان کیس بھی پہلی بار مجھے، کچھ کراہی تذبذب کا شکار ہوئی، جو میرے لیے برعورت کا خاتمہ رہا تھا، مگر میں اس کبھی کا مالک تھا اور اس کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ جمی رہے۔ کمالی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طراری میڈی ٹیکہ ڈسٹری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جسے میں نے پہلے وہی کسی ڈپٹی مہجر کے سیکشن میں منتقل کر دیا اور کمالی ہی کو پٹائی اسے بھی مقرر کر لیا۔ چائے یہ کمالی کی ترقی تھی یا سزاؤں، مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیا۔ کبیر خاں میرے ساتھ ہی میری گاڑی میں دفتر "تا" اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں بیٹھا ہر گاڑی ہی میں میرا انتظار کرتا رہتا، مگر جب جے کیوں کمالی کی اس سے جاں جاتی تھی۔ کمالی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں یہ گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لے جاؤں، کیوں کہ بھوں اس کے، کبیر خاں کا تھوڑا سا رقی بڑا خوف ناک تھا۔ اور خود کبیر خاں کے بھی کمالی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔ "ہم کو یہ "دبی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاب۔ یہ بڑا چاؤس ہے اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا۔" وہ دونوں میرے لحاظ کی وجہ سے ایک دوسرے کو بدداشت کرتے رہے تھے۔ میں نے کبیر خاں کو سمجھا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامد کی وجہ سے اپنی جگہ درجہ سے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دیا کا سب سے قدیم تقیہ رہے، جس کی دھار کسی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔

کچھ دن ایسی بچکانہ خبری کی خبر ہو گئے، مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے، میں نے اراحدہ کو گاڑی نکال کر اسے شہر کے وسط میں واقع ایک گھٹان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ تنگ سڑکوں، درگلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک کھلے میدان میں آ گئے۔ سامنے بھی تک وہی پرانا ٹھکانا صاف گولائی میں کنا پورٹ گیٹ پر تویراں تھا، "مستان۔ کیرج" میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کی دہلی بھر میں ہوا گئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی کیرج کے احاطے میں لے جانے کو کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتا دیا کہ کبھی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈھیر اور کیرج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے، مگر میں نے سنی بات سنی کر دی۔ کیرج کے برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا ساریڈیوینکا ہو تھا اور فضا استاد مستانے کے من بھاتے گاؤں کی آوار سے گونج رہی تھی "جو رو دیا، انہوں نے دیا، خیر و ب سے شکایت کون کرے" گاڑی در داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد وہی گناہواہاری کار کی طرف آیا۔ "جی صاحب! حکم کریں، مردوں کرنی سے پائنتی بدو نا ہے۔ نیوٹک بھی ہو جائے گی، پر آپ کی گاڑی کا ٹھکانا سب بند ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہماری درک شاپ پر۔" یہ کوئی بیانا کا تھا۔ کچھ ذرا باقی لڑکے وینڈنگ پلاسٹ پر اسی طرح وینڈنگ میں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کبھی میں وہاں ساراؤں بیٹھ کر چٹاؤں وینڈنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا "تمہارا استاد کہاں ہے؟" اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا، بے ٹھیک سے کام نہیں آتا، سے، جاؤ، بلا کر لاؤ۔" شاگرد گھبرا کر مدر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی عیسے میں بھری "اور سناٹی دی۔" "ارے کون سا سینما ہے میاں! ہم بھی تو دیکھیں، استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیر پھیری نہیں کی، ہم محنت کرتے ہیں، پچوری نہیں کرتے۔" استاد مستانے نے اپنے مخصوص صوبے میں سر پروڈی ٹیوٹی رکھے، اسکت پسٹ اور من میں پاس دہانے بڑا بڑا ہوا برآمد سے نکل کر گیراج کے گھن میں آیا اور ہمارا گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کو کہا، اور خود نیچے اتر آیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چہرہ تھا، جسے میں نے اتار کر اپنے کونٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ استاد بے حیالی میں غصے میں بھر میری طرف بڑھا۔ میں اسے دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔ "کیوں استاد مستانے! یہ کیرج ہے یا میر پھیری کا اڈا؟" استاد نے کے سامنے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بھڑکینڈ استاد سب کچھ بھروسہ کر لے گا۔ میرے تپور۔ کچھ کر کبیر خاں کا ہاتھ دوسری بندھے پہل کی جانب بڑھ گیا۔



پاکستان

[illegible][illegible]

یہ ہے "سداے میگزین" روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی۔ ٹی چند ریکورڈنگز، اے۔ ای میل۔

sundaymagazine@anggroup.com.pk

استاد دستا نے مکے شامگردوں سے بھی اپنے مطلوب پر آکس پاس پڑے دور اور بطور تنہی رہا ہے، کیوں کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس کا استاد اکیلا ہی ہم سے بھلا جائے گا، ابھی میں نے پلٹ کر پھرے ہوئے استاد سے کی طرف دیکھا "کم اور کم یہ سات سو سال پرانے پتوں پر بیٹے استاد اب تو اس کے رد و گامے بھی چاہیہر میں سنائی دیتے ہیں۔" استاد کا منہ کھلے کانکھوں رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہو گیا۔ در پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھمڑی سی جاری ہوئی اور ڈر کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ "اوہے وفا! اتنے دن بعد پہے استاد کی یاد آئی۔ مجھے رشتے نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ تم وہیں پہنچے ہو۔" سار گہیرا جہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا، در پھر چند پرانے شامگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد یک جگہ گھومنا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈاسٹ کر کام پر لگایا، مگر وہ سب بہا بہا سے میری کار کے گڑ پتھر کا بنے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی ٹی ٹی میں سے ایک تھا، مگر آج اس کے سامنے ان کے حوایوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا، ہم کمر در در بے بس انساناں ہم سے بے گرفت تک یہی تو کرتے رہتے ہیں، اپنے حوایوں کا پیچھا، اس خوبیوں کو بچ کرے کی دھم میں کس گھر ہر ایک کے حصے میں تعبیریں بھڑک بھڑکی ہیں اور گہیرا ج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ بھی میر حوای نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا پہنا ہوا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میر، مگر اس کی تعبیر کے لیے مہ نے مجھے، بھی کتنے طویل رستوں سے گزرتا باقی تھا کہ منزل ابھی تک لاپتا تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد مستانے نے گھر کے ہوٹل سے میری پسندیدہ دودھ دیتی چائے منگولی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹکڑے ٹکڑے دیکھنے لگا۔ ”تم نے تو واقعی کردکھا ہے۔“  
میرے دور میں میرا تو کمرات سے یقین ہی اٹھ چلا تھا۔ جو تم سے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دیکھ کر کہاں ہوتا ہے بھلا۔“ میں نے مسک کر ستار کی طرف دیکھا۔  
”صرف تھوڑی سی دولت تھی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بچا۔ استاد۔“ میں ابھی تک وہی پری رادھوں۔“ استاد نے پینتر بدن کر کہا۔ ”کمال کرتے ہو تم۔ دولت سے بڑی تہذیبی بھی کوئی اور ہوتی ہے۔ کیا؟“  
”لوگوں کی زندگیوں میں صرف ہر حاتی ہیں چند دھیلے کا منہ میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھو، سودا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی واوی بھی کی ہے یا نہیں؟“  
”ابھی تک وہی شرمیلے کنوارے یہی رادھوں؟“ میں نے حزرے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ”مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد اور پھر شکر کیا کر لے، اس کا استاد کنوارا ہے۔ یہ کہاں کا دستور ہے؟“ استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”کیوں اس غم میں میری لٹیا ڈرو؟ کی بات کرتے ہو پری رادھوں، اور یہ کیا بات کر رہی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی اور غلام تو کر کے دیکھو شکار کا پورا سوئسر پے کاغذ ہارو۔“ میں نے استاد کی بات دوسری جانب جا سب ڈوڑی۔ ”میری شادی کی بات چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ گھیراں کا یہ کیا حاس بنا رکھا ہے؟ گھٹا ہے برسوں سے رنگ دروغ میں نہیں کر رہا۔ کام دن گاڑیاں بھی اکا دکا کڑی نظر رہی ہیں، مجھ میں۔ یہ سب کیا ہے؟“ استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں دھندلے میں تو بھلا سودا چٹائی رہتا ہے، تم سناؤ کسی گز رہی ہے؟“ اس نے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے سے ہماری بات سن کر رکھول ہی دیا۔ ”بھئی گھیراں تو کر رہی پڑ ہے، وہ رانیں سارے۔ استاد لفظ بتا رہا ہے، کوئی دھندل نہیں، صرف منہ ہی منہ ہے، آج کل یہاں۔“ استاد نے ہنسی دیکھ کر ہاتھ دھکا دے ہوئے بڑی طرح سے جھڑپائی۔ ”کم بخت! تو ہار نہیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں اصل دیے سے، چل دے ہو، چکر اس اٹھ کر بیاہ کر دلا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، اور۔ کھانا دھڑوں کا تیری۔“ لڑکا مہمور ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ستار کی طرف دیکھا۔ ”یہ میں کیا س رہا ہوں استاد گھیراں کر رہی پڑا ہے، کیوں؟“ استاد نے ایک ہی سانس بھری۔ ”اب کیا بتاؤ پری رادھوں؟“ میکینک اور گھیراں جوں کا کام خستہ ہو چکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب بدل رہے ہیں۔ ٹیوٹک اور مرمت کی چیزوں کی مشینوں پر ہوتی ہے۔ ٹائر ہا نیوب کے آگے ہیں اور حمار کا کام اب ماڈرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس قریبی چند پرانے کھارے گاڑیاں باقی ہیں، جس کا مزج یہی مشینیں کچھ نہیں سکتیں۔ غریب چھوٹے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گھیراں کر رہی۔ دکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گھیراں کی قرتی یا پیدائی کے بعد دنیا ملک کہیں اس پنجوں کو بہ روزگار نہ کر دے۔ تم تو جانتے ہو، اس سب کے گھر، اس ہی کے دم سے پلتے ہیں۔ کئی دھندل سے کہا کہ کم بخت، جاؤ کر کوئی یا دھندل و حوض۔ پر، یہ میں کہ یہاں سے نکلنے ہی نہیں۔“ میں پچھ چاپ میٹھا ستار کی ساری بات سن رہا۔ ”میں کے پاس رگروٹی رکھا ہے یہ گھیراں تم نے۔“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ اسی علاقے کا ایک ماروڑی سینٹو بھلاؤتی ہے۔ قرتی کی تاریخ سے پہلے ٹک نہیں کرے گا۔“ مجھے اس سینٹو کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔ استاد نے قی میں سر ہلایا۔ ”نہیں پیارے استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ضرور دیتا کچھ نہیں۔“ میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کی دھوکے کر کے گھیراں بیچنے کو کہا۔ ”وہ گھٹے بعد ہی وہ بڑا یا اس گھیراں میں موجود تھا۔ میں نے گھیراں کے سب سے سینٹو شاگرد کو کوئی اور ڈرائیور کے ساتھ سینٹو کی طرف بھجو دیا، جس کا پتا گھیراں کے سٹی لڑکے جانتے تھے۔ میں گھٹے بعد ہی کئی دنیں رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔“ میں نے جاننا، وہی ”راوی کے کاغذ، ستار کی جھوٹی میں ڈال دیئے۔“ یہ گھیراں جتنا خراب ہے، نکاحی میر بھی ہے استاد۔ گلے بستے تک نئی کیپوڑا نرڈ مشین بھی ”جانے گی اور تیار رہی یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی گھرنی میں میرے اس گھیراں کو ایک دم منہ ماسپ بنادو۔ اگلی دھند جب میں اپنے گھیراں کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پتا استاد مستانہ چاہیے ہاں، مگر یہ بیٹو بہ بدلتا اس کے ہاتھ یہ گھیراں مکمل نہیں ہوگا۔“ استاد مستانہ گم سم سا ہاتھوں میں قرتی کھلنے کے کاغذات بے بیٹھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاغذ ہاتھ چھین لیا اور اٹھ کر وہاں سے جاے کے لیے نروا۔ استاد نے مجھے جیسے سے آواز دی۔ ”بھئی رادھوں۔“ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گھیراں کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑ تھا۔ یہ کم سخت، بے جان اور کھر رے کاغذ کے چند روپے اپنے اندر لکھی خوشیوں پر بقیہ جانے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرتے ہیں، شے دکھاتا ہے یہ جیسا۔ روٹوں کو ہنسا دیتا ہے اور ہنسلوں سے چھڑ کر انہیں "ٹھڈا ٹھڈا" سنواراتا ہے، اور یہ دولت مند کھٹے من جاں رہتے ہیں، اس پیسے کے استھان سے، کاش! من بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ من ٹکڑوں کے چروں پر یہی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی ملادی جاتی تو کوئی گھانے کا سودا نہ ہوتا، مگر عموماً قدرت جیسے دوست دینی ہے بدلے میں اس کا دل نکال دے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ نیا دس والوں سے حالی ہوتی جا رہی ہے۔

میرج سے نکلتے نکلتے سہ پہر کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ذرا رنج و گلاڑی مگر کی طرف سوزنے کا کہہ دیا اور پھر وہی پر میری نظر پئی پئی یونیورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی رکوری اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے باہر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے امداد و میرے ہی ہاتھوں دفن ہوا وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر دو تین سو سال سے کئی وہ سارے نظراتے والے بڑا بڑا یونیورسٹی کوٹھ اٹھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دفن جاتے وقت میں اپنی ساری تعلیم اور کلام میں کے ایک کلمے میں بند کر کے اپنے پرے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ چارے ب دو سو روپے رجنس اور کاغذوں کے اسنے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دفن دے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقوبت میں ایک ماؤں کی بھائی "ڈاؤر گوئی" تمہاری راد ہوناں "میں چونک کر پٹا۔ میرے عقوبت میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ ماصے پر ایک بر رگ شیر دانی اور جناح لونی پسے کھڑے تھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے لنگھتی ہندھے دیکھ رہے تھے "مئی" میں رہی راد ہوں۔ مگر آپ "؟؟" وہ میری طرف بڑھے۔ "بھوس گئے، یادداشت کی کمزوری تو بڑھا ہے سے مشروط ہوتی ہے، مگر میں نے تو تمہیں پہلی نظری میں پہچان لیا تھا۔" میری رباں سے بے اختیار نکل گیا۔ "مجھے پہچاننے کے لیے شاید یادداشت مشروط ہو۔" آپ شاید سراجھ ہیں، "ہمارے لائبریری اچھا راج "؟؟" وہ مسکرتے۔ "ٹھیک پہچانا۔ تمہارے چارے کے بعد اردو بر م ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کئی ہوئی تعلیمیں آج تک جامد کے ادبی پوسٹے میں تحقیق دینی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے وہی نظم "مگر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔" ہر سب جب بھی "تھیو سٹیج" کیا جاتا ہے، میں منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور ہر تی جاتی ہے۔" میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سنتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ انہیں بتا دوں کہ میں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کاش کی چند جیسوں میں اک دور سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور میں۔ انہوں نے خود سے میری طرف دیکھا۔ "مگر ایک بات میری کچھ میں نہیں آتی، تم چانک یوں دینی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے تعلیم عمل کی یا نہیں؟" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کچھ مجبوریاں تھیں سر مجھے دینی چانا پڑا۔" سراجھ سے پٹ کر میری قیمتی گاڑی اور کارڈار کی طرف دیکھا۔ "گتا ہے، تم سے وقت ضائع نہیں کیا وہاں۔ لیکن تم یہاں باہر لانا میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔" شعبہ دو میں اکثر تمہاری نظروں پر بات چلتی ہے۔" میں نے طریقے سے معدومت کی۔ "میں سر " آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کئی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائے گا۔" آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونیورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ منٹ کھٹ ہی لگتی تھی یاد آتی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سینما جاہد سے شادی کے بعد بھی اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا تھا۔ بھٹی کی ماں کے ایک بھلے نے میری زندگی کے تمام رستے بند دیئے تھے، مگر میں دوست کرنے کی دھن میں ایسا کس ہوا کہ۔ اپنے اندر بیسے والے اس حساس درنازک اس کو بھی کچل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے چھادہ دست تھا لیکن اس ساری تک درد سے مجھے کیا ملا۔ میں تو "ن بھی تباہی تھا اور اکیلا تھا۔ کسی کے ترس و دما میں تھا، کسی کے دست طلب میں۔ کسی کی "کھانکا نور تھا، کسی کے دس کا قرار۔ مجھے نہیں پر بیٹھے جاے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ ہر اندھیر پھیل کر شام کو رات کی سیاہی میں پیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی صد کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگتے تھے، اپنے دوست۔ تبھی تو جب دن شدید خشک سے ہزار ہوں کر شام تک ہلچلے لگتا ہے، تب شام اپنی مہریاں پہلی رات کو آو دے کر بدلتی ہے اور رات اپنی کان شال میں اس تھکے ماندھے دس کو سمیٹ کر ملا جلتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھر پور دن "تکھیں موندے سو یا رہتا ہے، اس میں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد مارم سے "کرتا یا کہ کدای مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کدای نہیں پر آیا تو معصوم سے کچھ زیادہ تکلف لباس میں ملیں تھا۔ "یہ کیا سر " آپ، ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سینٹر رحمان کے فارم سے ملنا چاہیے۔

ہاؤس جاتا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت حامل طور پر آپ کے اعز میں معذرت کی جا رہی ہے۔" میں نے جان بوجھ کر اسے "کوشش کی۔ "میرا مو نہیں ہے کدای، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دینا۔" کدای گڑ بڑا سا گیا۔ "نہیں سر چھ نہیں لگے گا، سارے شہر کے امر و ہواں کھنڈے ہوں گے اور پھر میں وہاں اپنے نے فیڈر کے، میدانوں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔" کیا یہ کاروبار ہے، پانامر۔ یہ میل جوں رکھنا ضروری ہے۔" میں نے دایرہ غور سے خود کو بڑی مشکل سے آباد کیا اور گھنٹے بھر بعد ہم سینٹر رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گامزن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک یا مشغلہ جتا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھریا جانکا ہونے کے باوجود، کسی دیرانے میں بیکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ساری کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤس ایک طرح سے امرا کا "کلیٹنس" سہل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پڑوسے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سینٹر رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسی ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور کالٹ کورس کے درمیان ہی ٹھٹھکی ہی رت، جس کے "س پاس مصنوعی مہر اور غوروں کے درمیان پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ سارے مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ اس کی جلیقت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے دنوں میں جنت کا تصور بھی تو بہت ہی کم دن دھنڈے، چشموں اور گھنٹے



سایوں ہی کی صورت نکلتی ہے۔ سارے فارم ہاؤس برقی قہقروں سے جھنگھار ہاتھ، پارلی کیو کا بندوست بھی باہر میرے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر لگتا تھا کہ ان کے میرا کافی تفصیلی تعارف کر دیا تھا۔ سچی وہ سب مجھے کبھی طرح چاہتے تھے۔ میری کہنی، گلے، پیچھے ایک بہت بڑا آرٹریڈ رکھنے والی تھی۔ "میری"۔ "ت کی فرم تھی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھکانہ دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود کبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دل چاہی کا ٹھکانہ کر رہے تھے۔ سینئر رجسٹرار پاس کچھ سال

ایک ٹھکانہ اور شوقین مزاح نگار تھے، جسے ہاتھ بٹا کے فن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فردا فردا کبھی مہمانوں سے میرا تعارف کر دیا اور وقتاً فوقتاً نئی گفتگو کے دور میں مجھے یہ بتاتے ہیں کہ قطعاً عارضی نہیں کی کہ وہ ہماری کہنی کے ٹھیکے میں کافی دل چاہی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمان جس طرح سینئر رجسٹرار کی تعریف میں رہیں۔ ان کے قلابے مار رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمان کو بھی خوش کر رکھا ہے۔ "کیا بتاؤں سر جی۔۔۔ یہ اپنے رجسٹرار صاحب کو یاد دلا سکے یا نہیں، بڑا اہلکار رہتا ہے، ان کے فارم ہاؤس پر۔ سو بائی اور حقائق دور دورہ اور کوشش تو سمجھیں کہ اس کی دلدادہ ہے، آج بھی جو کافی مشہور اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان کی کمان ہے۔ کبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رجسٹرار صاحب سے سیکھے۔" کمان کی یہاں قہقہوں کی طرح چل رہی تھی، اس محفل میں مجھے ایک اور اور ایک ہو۔ حلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے طور پر ملے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں رزق برقی اور مچھلیں کرتے میزبان میں جو تین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آراء و ماحول میں یہاں وہاں اختلافی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور "دوست" اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے کئی نے مجھ سے بھی منسلک تھے ہوئے ہاتھ ملا لیے۔ کبھی مشرقی انداز میں رات نے اور مرد نے کاروبار ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور بانیوں کی محفلوں اور محفلوں میں مرد اور جو تین لگ لگ محفلوں میں شریک ہو کر تھی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا اس بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دوست اور پیسہ ان کے پاس آج کے ان دوستوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ "راڈیو" اور بے خوابی ہمارے معاشرے میں کہاں سے ڈھائی۔ چونکہ ان کی ابتدا پھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا تعلق بھی پھر کے دور ہی پر ہوگا۔ درمیانی مدت عمل عروج و زوال میں ایک سرمدال کا محفل ایک دورانیہ ہی تو ہے کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر موسومہ و رسموہ شریکات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ اسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار رہ سکے، مگر شام ہوتے ہی ہم میں سے اکثر اس ہوش مندوں سے گھبرا کر خود کو بد ہوشی کے بحر میں گھسیٹنے میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات "آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے راجہ، ہونو بد ہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور معمولی سے جلدی

میں نے اسے اسے کہہ کر کہاں سے نکالنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ "ت کی جلدی سر۔ کھانا اس لگنے ہی والا ہے۔ سینئر رجسٹرار کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چس دیا جائے گا۔" میں نے کنہش سے کمان کی طرف دیکھا۔ "ہماری عارضی لگ گئی ہے، تم ب یہاں سے نکلنے کی کرو۔" کمان نے سر ہلایا اور سینئر رجسٹرار کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے بھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رجسٹرار کمان کے ساتھ تیز اور بے ڈنگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ "یہ کیا ہے، راجہ صاحب! آپ بھی سے چل دیئے۔ بھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے چلتی بھی نہیں۔" میں ویرے سے مسکرایا۔ "میں شام دیر تک اوس میں بیٹھتا ہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے، پچھلے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہو ہوں میں۔" سینئر میری بات سن کر دور دراز قہقہہ لگا کے ہنسا۔ "خوب۔ بہت خوب۔۔۔" چوتھی میں تو جھٹکا تھا کہ پورے شہر میں صرف ایک میں ہی بدلہ سنبھاتی پچا ہوں، مگر آج اپنا مقابلہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی وہاں نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت ہی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم راہ سے واسطہ پڑا ہے۔" میں نے بہت جان بچوانے کی کوشش کی کہ "کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سینئر رجسٹرار زہمیا۔" ہمیں بھی، بھی تو آپ کو اس محفل کی جال سے ملنا ہے، مشہور پارہ، چوٹی کی، ایکٹریس ہیں بڑی مہم چال ہے انہوں نے فلم غم ستری میں۔ ویسے تو وہ کسی کسی پبلک ٹیلی ویژن پر آتی جاتی ہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیر۔ مراسم کا حیا ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ نہیں، شاید یہ سن ہی کی گازی ہے، وہ آئیں، آپ بس دو لمبے انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے ان سے۔ وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ چاہیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔" سینئر رجسٹرار جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے من ہی میں چل کر دیا کہ وہ بعد مجھے حاسا ہی کہتا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سینئر رجسٹرار، ایک رزق برقی، ناز واد کے چکر کو لیے میری طرف آنا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر جب اس کا نام مشہور پارہ نہیں تھا۔ مشہور پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر دوپٹے میں گھس گئی

انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔ انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔

پھر ایک شخص نے کہا کہ یہ تو ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے۔ انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔

یہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔ انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے۔ انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے، یہ ایک عورت ہے۔ انھیں دیکھ کر وہاں سب نے ہنسنے لگا۔ وہ سب ان کا کہنا سن رہے تھے کہ وہ ایک عورت ہے۔

کی لگائی جاتی ہے، اس اس اور رشتوں کی کہیں اچھا میرے ایک سوال کا جواب دو، عام طور پر انسان، جیسا کہ میں نے کہا ہے، "کمانی نے بدنامی جو بد دیا ہے خواب ہارے کرنے کے لیے سر اپنے لیے آسائشیں اور آسائیاں پیدا کر کے لیے، اور اپنے لیے خوشیاں خریدے کے لیے عزت اور رتبے کے لیے۔" ٹھیک کہتا ہوں، مگر جب کسی کا کوئی خواب ہی باقی نہ بچا ہو، اس آسائش اسے پوچھ لگتی ہوں اور اس کی خوشی کسی ایک لمحے میں جاہد ہو کر رو گئی ہو، تب وہ غصے کیا کرے؟ "کمانی" کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر شاید وہ غصے اس دیا کمانی نے ہوسر کیوں کہ "آسائشیں" تھیں اور خوشی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ میں مسکرایا۔ "ہاں کوئی، یاد ہی ہوگا، جسے ان چیزوں سے ڈلا رہو، مگر بھی کچھ باقی ہیں وہاں۔ مجھے سو گریز میں بھی کچھ وقت لگے کمانی۔ خیر چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے، اور کمانی، تم نے بھی تو سینئر رہاں کے ساتھ ایک سو دیا کیا تھا، تمہارے سو دیا کیا ہوا؟" "کمانی نے گزرا کر میری طرف دیکھا۔" میں سمجھا نہیں، کیسا سو؟" "ہاں، وہی سو دیا، جو کنٹرولنگ سینئر رہاں کو دلوں کو صورت میں نہیں چاہی، کھڑے پہ منافع ملنے کے بدلے ملے ہوا تھا۔" کمانی کے چہرے پر ہوا یاں ہی نہ نکلیں۔ "وہ سر وہ میر مطلب ہے" میں نے غور سے کمان کی طرف دیکھا۔ "گھبرے کی ضرورت نہیں کمان میں نہ ویسے بھی وہ ٹھیک سینئر رہاں ہی کو دیتا تھا۔ اس میری تھی بات یاد رکھنا جیسا کہی عزت نفس کا غم الہدیں نہیں ہو سکتا۔ وقت ملے تو میری دانت پر غور کرنا۔ یہ تم جانتے ہو۔" کمان سر جھکا کر میرے کمرے سے نکل گیا۔

اگلے دو ہفتے بہت معروف گزروے، اس دوران میں اپنے بھائیوں کے لئے گھر بھی ہوتا، بسوں کی طرف بھی پکڑ لگایا، خوب "ڈبکت" ہوتی میری، مگر اس میں سے کوئی بھی، یہ بات اپنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ میں ہوں تھا اتنے بڑے گھر میں پوری زندگی گزار دوں۔ سبھی کو میرا گھر بسا ہے کی جلدی تھی، مگر اس میں سے شاید یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب دس بی مل جائیں تو گھر نہیں بسا کرتے۔ میرا بھی مل کر کھو چکا تھا۔ اب کون مید کوئی اس باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کسی کوئی نظر میری طرف بھی نہ لگے گی۔ ہذا ہر میرے ارگرد سبکی بہت سی مارینا گئی تھیں، جن میں سے میں کسی ایک کی جانب بھی اشارہ کر دیتا تو اس کے گھر دسے بہ صد خوشی سے میرے ساتھ رخصت کر دیتے، مگر یہ میرا نہیں، میری طاہری شاہ و شوکت، اور اس دوست کا کمال ہوتا، جسے ابھی تک خود میرے گھر دسے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے، اور چنگوٹیاں ہوتی رہتی تھیں کہ آخروں میں اس کے اندر اندر میرے ہاتھ اٹھ دیں کا ایسا کوس سا چہرہ لگا ہوا کہ جس سے میری گایا ہی پٹ دلی، ہمارے معاشرہ بھی کتنا دغلا ہے۔ جس شخص کی غیر موجودگی میں اس کے رہتے اور دوست پر ناجائز ہوئے کے شک میں گزارا یا تم بناتا ہے۔ اسی شخص کے آئے پر اس کو پوری تعلیم کے ساتھ کڑے ہو کر ملتا ہے۔ اس سے ہزار سفارشیں کر دیتا ہے اور ساتھ کڑے ہو کر تصویریں بناتے ہیں فخر محسوس کرتا ہے۔ ہر ورکر ٹھیک ہی کہتا تھا، دوست ہزار عیبوں کا ایک پر ہوا ہے۔

پھر دو روز بعد محمد صاحب چند طلبہ کے ساتھ میرے دفتر آئے اور بہت اچھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ اس سال کا یونیورسٹی کا سالانہ رسالہ بھی لائے تھے، جس میں میری تین بہ انی انھیں بھی تھیں۔ میں نے اس کے، کھانکار کے ہاؤس یونیورسٹی کی برام ادب کے لیے سال بھر کا چند اس کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی میری کہنی سے شہر کی تقریب ہر بڑی ادبی تحریک اور تنظیم کو علیحدت جاتے رہتے تھے۔ شہر میں، میں کافی ادب دوست مشہور ہو چکا تھا، مگر میں خود اس ادبی پروگرام میں جانے سے گریز کرتا تھا، کیوں کہ اب میں شاید، اپنے اظہار اور شخصیت کے اس وسیع تصادم سے کٹا چکا تھا۔ یا پھر اچھے لفظ اور اچھے خیالات صرف، اچھی شخصیت کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ مجھ جیسا کوئی کہنے ہی او۔ نچے خیالات کو اظہار کی خوب صورت، ہلا میں پرو کر پیش کر دے، حرف بے وقعت ہی رہتے ہیں۔ میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دس دن بے بھیا کسی کی سفارش کے لیے دفتر آئے تو میں نے سے اپنے پرانے رجسٹر اور سو دوں کے ہارے میں پوچھ بیٹھا انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی وہیں پر نے گھری دو جھتی وے ٹرنک ہی میں پڑے ہوئے شاید، کیوں کہ بہت سا سامان نئے مکان میں منتقل ہونا باقی تھا۔ یہ نے گھر کا سود ہو چکا تھا اور کچھ دس میں وہاں سے سارا سامان بھی اٹھونا تھا۔ چائے میرے دس میں چائیک ہی میرے پرانے گھر اور محلے کے لیے ایک دم ہی ہو گئی کیوں تھی۔ میں نے کاغذات تلاش کر کے بھائے بھائے کے ساتھ ڈر بھر کو بھیج کر پرانے گھر کی چابی منگوائی اور ہی شام عصر کے وقت میری گاڑی میرے پرانے محلے کے سارے خوردہ لکڑی والے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی محلے کے بڑے میدان سے ہرے سارے کوئی۔ سامنے کچھ بچے کچھ کھیل رہے تھے۔ میں بہت دیر وہیں کھڑا، انہیں یہ نہیں کھیلتے، بیکٹا رہا۔ عرب محلے کے بچوں کے کھیل بھی سدا عریبہ ہی رہتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنی گلیوں اور اسی میدان میں باقی بچوں کے ساتھ سارے دس بچے دو لگی ڈنڈے کا کھیل کھیل کر رہا تھا اور شام کو ہمیں بھپائی، مگر زندگی میرے ساتھ ابھی تک ہمیں بھپائی ہی کا نہیں کھیلتی آ رہی تھی۔ محلے کے پرانے کیسوں میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ زیادہ تر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ غربت الہت وہی پرانی تھی۔ میں نے کبیر خاں کو اپنے گھر کا دروازہ کھولنے کو کہا اور پھر اسے گاڑی کی جانب واپس بھیج دیا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری انکھوں میں ترقی نمی دیکھ سکے۔ ہمارے کچھ بد بات اور حساسات بہت آتی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی کے ساتھ بات نہیں سکتے۔ میں بہت دیر تک اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا ان بچوں کو یاد کرتا رہا، جب میں اپنے گھر سے تڑپا اپنے چھوٹے قدموں سے اس صحن میں دوڑنا پھرنا تھا، ہاؤس پرانی خانے سے

اماں کی باجیوں کو ڈانٹنے اور گھٹنے پرے کے گرتھانے کی آدیں آتی رہتیں۔ باجی میں پناہ سہجائے کھانتے اور حیار پڑتے رہتے۔ میں منی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بی کھلونا مور کا رکے لیے راتے بناتا رہتا اور دس میں سو سو مرتب اس رنگ گلی کار کو اماں کے دوپٹے سے چکاتا رہتا، ایک لمحے ہی میں میرے آگ پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر چھٹا کہ وہ سب مجھے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت اب کے نئے کانٹرو، ہموں اور ہاؤس پرانی خانے سے آتی گرم پھلکوں کی جھلک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ کاش میں ساری زندگی وہی پانچا چھ سالہ بچی راوی رہتا، کبھی بڑا ہوتا جائے ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے بڑی رہی تو ہوتا ہے، تو اگر میری بھوی بھان ماں سے مجھ جیسے کا نام بھی پڑی راوی رکھ دیا تو اب کیا مٹاؤ کیا۔ میری انکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی "ہاؤس بھی گونجتی محسوس ہوئی۔" پڑی راوی بیٹا۔ تم پڑی راوی ہونا میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دیا سے اپنی سوٹ "یہ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابا کی آواز سمجھتا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچی کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی انکھیں پونچھ کر پٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھولا دیکھ کر کھلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے، کھلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب دولٹ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھیلا تھا۔ سبھی کھل مل گئے اور بڑی یا دوں کے سب در پیچہ وا ہو گئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور بڑی ہائیں یاد کر کے کبھی بیک وقت خوش اور غم گین سے ہو گئے تھے گویا یاد اسی صرف میرے لیے ہی غم نہیں تھی، اور ابھی بہت تھی، جو اس غم سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر خیراں اور دس سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے در بھی









قرۃ العین بخاری، اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسویدہ پروگرام "بزم ادب" کے ساتھ حاضر ہوں گے، شب تک کے لیے اپنا بہت ساجیال رکھیے، شب بخیر۔" میں پروگرام سننے میں اس قدر رگس تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر نہ دھنس پڑتے، وہ گنت سوچوں میں گزری، مجھے پتہ نہ تھا کہ استاد کی بات ہمیشہ پوری ہوتی تھی کہ لفظ اپنے حلق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اس کی پیچاں بس کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی ہیر میں مروا جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونیورسٹی کے سہارا بن گئیں، میں بچھپ کر ہوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت ہی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونیورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے، بیٹھے تھے اور کالی تھا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے کی تمام تقریبات کے اجلاس میں ہوتا تھا۔ مگر اس روز ان کے تئیر ہمارے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ نہ کریں انھیں گے، اور پھر یہی ہوا۔ اگلی شام یونیورسٹی کی بزم ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی ممبرانہ صوبہ کی خصوصی کے طور پر درج کروا دئے تھے۔ میں نے یہی کرنا دیکھا، لیکن وہ مشکل دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ "سندھ لکھی" مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتانا کہ میں بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پیسے ختم ہونے لگتے ہیں۔ وہی جتنی نظریں، جو مجھے اپنے تئیر پر ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دلی دہری سرگوشیاں، طنزیہ مسکرائشیں، کاش احمد صاحب میرے اس دن کا کارڈ کی حالت سمجھ سکتے مگر یہ ہوسکا اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے آؤں پر میرا نام پکار گیا، تو میں نظریں نہ کھائے، ایک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہاں میں تمنا شایوں کی جانب روٹی ملتی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے، وہ ایسے بھی اسٹیج کا غاصد بھی روٹی کرسیوں سے کالی رہا ہوا تھا، اپنی سانس درست کرے میں مجھے چند لمحے طرید لگ گئے۔ میری آواز خود مجھے، جنسی کی لگی۔ طلبہ اور دیگر وفد سہماک سے میری بات سن رہا تھا۔ "میں کوئی شاعر، مقرر یا ایڈیٹر نہیں ہوں۔۔۔ بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک پہنچا رہی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جو حق ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام ساتھ کارڈ گزار ہوں، صوبہ سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند اپنی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو مدد رکھا۔ یہ شعراء اصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحات پر نہیں لکھیں تو آپ لوگوں سے ہائٹ نہیں۔ آپ لوگ سے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسن ظن اور طرف ہے، اور یہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔" میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو دور کھڑا میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگائے ایک تھلی ہی ٹرکی کھڑی ہوئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا، ایک ہاتھ میں لے کر بولی۔

"سر! میرا نام قرۃ العین ہے۔ میں اسی یونیورسٹی میں فائل ایڈیٹر کی طالبہ ہوں، دورات گئے ایف ایم ریڈیو پر "بزم ادب" کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سینے والوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچ رہی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ یا سننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونیورسٹی کے بعد گیارہ کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا "بزم ادب" سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟" میں نے مختصر جواب دیا "جی سرور" مگر غم دور ان نے کچھ سہت دی تو

ابھی ایک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہوگئی، کبھی کبھی وقت کی چاہیں بھی کتنی ہی تلی ہوتی ہیں۔ تقدیر بنا سکرہٹ کیسے دھیمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ تقدیر کا یہ مسودہ گئے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آئے والے محشر سے بہتر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر نہ ہوا تو کمالی سے رہائش گیا۔ "سر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونیورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی۔" میں نے میرے سے جواب دیا: "یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف ہماری شناخت ہیں، مجھے خود بھی حیرت ہے۔" اس میں حیرت کی کیا بات ہے سرتی۔ یہ آج کل کی لو جو ان سسل ان چیزوں میں بڑی دن چھٹی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹریٹ اور تھی کی سسل فون پر بھی جرم اس چیر دن کو نہ دیکھے ہوئے ہیں۔ یہ میرا درد غائب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سر۔ بظاہر بڑی نا اہل ہے یہ سسل، مگر پے مطلب کی چیز پڑھتی رہنمائی ہے۔ چاہے کتاب کے درجے یا کسی اور طرح۔" میں چپ رہا۔ "مے ہاں یاد آ رہا ہے ایک ایک کی ڈی۔ جے ٹی کے آپ کا بیل بھرنا لگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہر مست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھے بتائے فہرستوں سے لیا ہے، مگر خاص ناکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کرے۔" اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک جینی سرنگ۔ لگا۔ قیسری کال پر ہنجر مجھے خون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف دہی تھی "معاف کیجئے گا سر! شاید آپ کے میسج پر آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے میں ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں۔ ہم آپ کے صرف دس منٹ میں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟" میں نے کچھ لمحے توقف کیا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟" وہ مہنویت سے بولی۔ "کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کامیابیوں کے بارے میں، آپ کی دب و دقت کے بارے میں۔ سنا ہے، شہر کی کبھی بڑی، بلی تقریبات اور استقبال کے منصوبوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامنے تک پہنچانا چاہتی ہوں، آپ کی ترقی کا راجہ جانا چاہتی ہوں عام طور پر ادب سے نچرے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دور سمجھتا ہے۔ یہ ریب شاعر عموماً مفلوک خیال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانا چاہتی ہوں۔" میں اس کی باتیں سن کر جیسے میں پڑ گیا۔ "مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟" وہ مس پڑی۔ جیسے بہت دور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ "احمد سر! یاد آ رہا ہے، پھر میرے ریڈیو پر پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی اربلی ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سب سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت مختصر رہتے ہیں آپ کے بارے میں۔" وہ اپنی دھن کی پٹنی لگتی تھی۔ میرے دکھانے کے باوجود، مجھ سے پے لگے دور کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ ایسے میں کامیاب ہوئی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ رات اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت دور پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شاید یہ الجھن تھی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے پے پٹی کے کوئی کادانی لون سرملائے دکھ، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر چمکایا تھا۔ پٹی سے سنے کاں مد کر میری طرف فراسٹرنگ، تو دوسری جانب سے اس کی پہلی یقین اور ٹھٹھکیاتی سی آواز سنائی دی۔ "اوسے سر! آپ؟" کتنا عجیب اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں رہا کہ آپ نے خود مجھے کال کی ہے، میں بھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی۔ میں نے میرے سے کہا: "آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیسے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟" جی سر! کیوں نہیں، مگر کوئی خاص وجہ؟ "ہاں نہیں، وجہ شاید حاصل ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت جلد ہی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔" دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ "ٹھیک ہے



سر جیسے آپ کو سب ملے، مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ سے پروگرام سے کالی دیہ پچھے خود فون کر کے معذرت کرنی اور نہ عام طور پر نہ لوگ ہمیں اطلاع دیتا بھی پسند نہیں کرتے، اپنی کسی عیوضا صری کی۔ مگر آپ کو یہ وعدہ تو سبہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ جب بھی خود کو کوئی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے۔ میں بس ہڈی ہاں چلیں وعدہ بھلے گا ایک اور وعدہ بھی میری شکل مجھے کا شکر ہے۔ میں نے غور کاٹ دیا، مگر کہیں دور کوئی دوسری لاکھ جو رہی تھی۔ میرا ناداں دل سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے خبر پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صرف ایک ہی بات ساری رات سمجھا تا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بھڑکی گئی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے ناداں میں وہ لوگ، جو بے در کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تکیہ دینے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی پہنچتے ہیں۔ ضرور، آواز دھو جی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں۔ میرا دل بھی بے لگام ہونے کو تیار تھا۔

انگلے رور سے چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا تھکا کرنا رہا۔ اور پھر شام ڈھلے، جب تھک ہار کر میرا بے چہیں من ہڈی بے وقوفی پر مسکرا کر کچھ آرام پائے کو تھا تبھی اچانک اس کا فون آگیا۔ قسمت کی تھک چھوٹی، دولت کا انتخاب خوب بخش کر کرتی ہے اور پھر اس نئی فون کا نرکا دور یہ اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ اس بھڑکی مصروفیت کی، شام کی چاہے کی، رات کی چھل قدمی کی مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی حاسم تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اس دن یونیورسٹی کی تقریب کی ملاقات کے بعد میری تھک دوپہر کبھی غیبی سے ملاقات میں ہوئی تھی، وہی میں نے دوپہر کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ نئی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی ہالشاہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوپہر بھنی کے سامنے بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ اس بے ہال میں مجھے کافی خاموشی سے اور نکلے انداز میں دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس اور روشنی میں اس سے ملنے کی تمنا ہی بھلا کب تھی۔ میرا من چلتا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے، کیوں کہ مجھے اُن کی روشنی میں نہیں آتے تھے۔

انگلے رور میرے خلاف نہ خوب صورت سجاوٹی کاغذ میں پیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بھیجنے والے پتے میں قراۃ العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جاے کے بعد حقیقت سے کاغذ کی پتلیں کھولیں۔ اندر سے ایک خوب صورت سالانہ ٹیبلٹ مجھ پر آدھو، جسے کمرے میں کہیں بھی شوپیں کے طور پر رکھا جاسکتا تھا۔ میں نے جلدی سے غیبی کا نمبر دیا۔ دوسری جانب سے اس کی کھینچی ہوئی آواز بھری۔ "میں جانتی تھی سر آپ کا فون آنا ہی ہوگا۔ کیسے، کیسا لگا تھا؟" "بہت اچھا۔ مگر موقع مل کچھ کہیں سنا، میں اس فون کا۔ آپ بے تکلف کیا یعنی" "وہ ہنس۔" "میں سر بالکل بھی تکلف نہیں ہے۔ یہ میرا مشفق ہے۔ فارغ وقت میں ہمیں منی اور پائسٹریٹ میں سے غصے ہاتھی ہوں۔ میری اپنی ایک بھولتی آرٹ گیلری ہے، میرے گھر کے اندر اس میں یہ عشق جاری رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی آئیے اس وقت نکال کر، میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی۔" میں بولتے ہوئے اُنک سا گیا۔ "ہاں کیوں نہیں، مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں، ایک ہی پارہ پڑے ہر بتاریں۔ کبھی کبھی حیرت و حیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے۔" میری بات سن کر وہ شرمائی گئی۔ "نہیں نہیں، مجھ میں بھلا کیا منر ہوگا اس وقت کانے کے بہانے ملاشتی ہوں۔ بات آئی گئی ہوئی مگر میرا بھون من اس لڑکی کے منر کا شکار ہوتا گیا۔ اس موہ بیٹا بھی تو ایک منر سے۔ شاید دیا کا سب سے بڑا منر۔ اور میں اس کی اس کاریگری سے خود کو بچا نہیں پارہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح غلطی، مگر بڑے لگی۔ شام ہی سے میری طبیعت عجیب بے چہیں اور داس کی تھی، مجھے یک بار پھر اپنے اس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کو چپ کی لگی ہوئی تھی کہ چانک غیبی کا فون آگیا۔ "کہاں غائب رہتے ہیں سر آپ بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آئے آجاتا ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "میری مصروفیت اس ایک مڑ ہے، آپ کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟" "وہ کچھ دیر چپ رہی۔" "اور اصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں سے ساری دین کو دکھاؤں گی۔" "جائے کیوں میں بھری میں، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اڑے کے موا میں ہے۔ اس نے مجھے دور سے ہی کسی مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے دور پردہ میرے چہرے کی تعجب کا یہ طریقہ نکال لیا۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔ "مجھے خوب صورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں کس بھی۔" "اور میں؟ سبہر حال، مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی۔ آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلیں۔" میں نے فون بچا دیا۔ وہ ویسویلو کرتی روگنی، مگر میں نے، گلے پورے لئے اس سے بات نہیں کی۔ مگر کے فیسر پر غور آیا بھی تو خلاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا یہاں کر دے۔ اس نے کچھ خط بھی بھیجے، مگر میں نے پڑھے بنا ایک طرف رکھ دیے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آگئی۔ میں "فس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گورے چہرے پر پہرہ دھائے بیٹھا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی ڈور بندھ گئی، جیسے وہ بہت دیر روٹی رہی ہو۔" "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" میں چلا تھا۔ "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صورت کا مذاق ہی ڈالتا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا بیٹیں، مگر یہ مجسمہ" "وہ روپڑی۔" میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی۔ آپ میں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ بنے میں بنا رکھا ہے۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" اس نے ہڈی "گھوڑوں سے چشما اتارنا" میں دیکھ نہیں سکتی۔ "تو جانا ہوں میں۔" ایک رور روجھا کا سا ہوا، اور میرے ارد گرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا مدھیر پھیلا چلا گیا۔

وہ دن ہے



دوب کی ہدی راو۔ میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے یادگار پہچانیں ہوگی اس فلم میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، کہ تمہیں پسند آگئی تو میں رانٹر سے کہانی پر کام کرے گا کہہ دوں گی، مگر تمہیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہرا محسوس کروں گی۔" لٹنی چلی گئی اور میں شام کو کسی مہموں کی طرح بھی کی گہری پہنچ گیا۔" اے گیلی مٹی گوندھتے دیکھ کر نہ چائے مجھے ہر دایا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا نہتے سے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب باتیں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا انداز بیاں کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ذہنی شاموں اور راتوں کے طقس کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے گھنٹے میں بھی کمرے کے گھر سے نکلا تو ہونٹا چل رہی تھی۔ "ہاں ہاں ہاں کے جھنڈ جہرت سے اس نے ہدی راو کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، ہر سانس میں چند بودوں نے ٹپک کر میری گاڑی کی وینڈ اسکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی رہتی ہوئی برقی بارش میں اپنی دوسری سٹیپوں سے جا بیٹیں۔ کیر جان صاحب مہموں چوڑا سا ڈر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا اور دُور پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسنے میں بھی کانبر میرے بل لون پر حکم گانے لگا۔ "ہدی راو! کہاں ہو تم؟" جی شہر کے اٹھنے والے۔ "وہ نہیں پڑی۔" اسنوڈ پوچھتے ہو بھی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملنا ہے۔" میں نے کہہ خاں کو اسنوڈ پوچھنے کو کہا۔ ہم دیران سے فلم سٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے طبعی ولی عورتیں درمیان میں اندر گھومتے نظر آئے۔ عجیب سی وی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ بڑا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کیر کا حید اور کاندھے سے لگا ہوا محل دیکھ کر وہ سب کچھ جڑ سے ہونگے۔ میں نے کیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جا کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ مائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لٹنی نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جا ب کو نے میں ایک بوڑھا شخص

ہارمونیم سامنے رکھا میٹھا تھا اور اس کی آڑ میں کئی سٹائی یک شریلی لڑکی، چھوٹی موٹی سی بی بی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھاتا رہی تھی۔ ہائی لوگوں کی جھپتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے رپار ہو رہی تھیں، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا، تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہوتا، مگر ابھی تک وہ وہیں دکی چھٹی تھی۔ لٹنی نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنے حال ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پیلوں میں موٹی لڑکی مشتمل ہے، استاد بنے حال کی بیٹی اور آج وہ دونوں لٹنی کی آنے والی فلم کی ڈھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک بلی عمر کا تیز طرز رسا بندو تھا، جسے فلم بننے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی، اسے کھانے جاری تھی۔ "بس یہی ڈاڑھا صاحب! کیا بتائیں آپ کو کبھی یہی فلم سٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شہت چلتی رہتی تھی، کہیں مدیم صاحب، تو کہیں محمد علی صاحب۔ کہیں شہد تو کہیں وحید مراد، کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوڈ روٹ اپ لے نیچے دیکھتے ہیں، یہاں تو بیک وقت تین تین گاہے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ اس پھر۔ چائے کیا ہوا سب بڑا ہوتا چلا گیا۔" سب تو سنا، مگر میں ایک "وہ فلم جی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔" سیکڑوں کاری گرو اور ان کے حاندان بے روزگار ہو گئے۔ "وہ مزید ہمارے کے پوٹھی بولنا رہتا، اگر لٹنی اسے اشارہ کر کے روک دیتی۔" لٹنی ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلٹ محبت کی کہانی پر مبنی تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ ہائی ساری کہانیاں انہی کہانوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر دہر بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کائنات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی پیشکش اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد نے حال اپنا ہارمونیم ٹھانے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ مشتمل بھی استاد کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئی، اور استاد نے راگ جھینوریا لڑکی کی آواز واقعی سُر بنی تھی اور گلے میں جلا کا لوچ تھا۔ دو گاہے کے دو یوں رہا ہوا اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی برتی جیسی نگاہیں اٹھا کر

دیکھتی کہ میں دس چھل سے رہا ہوں یا نہیں۔ جس کو بیٹھ ستائش کی تمنا رہتی ہے اور شہین کار کو اپنے قدر داروں کی نظریں پڑھنے کا ن آتا ہے۔ جب بارش کی پہلی بود گرے تم چلے، میرا سدا یہ ملے نہ ملے تم چلے۔" باہر برقی بارش کے حلقہ تک کے ساتھ مل کر استاد نے حال کے سُر اور مشتمل کی ریلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ سدا نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی سے بی۔ اے کر رہا ہے، مگر اب وہ اسے اپنے ہائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ نیگم نے انہیں اپنی ہی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ سب میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد سر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی حستہ حال اس دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے جتنا کسی بہت بڑی مجبوری سے یوں بیٹھی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے حاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے اس باپ بیٹی کا نر پاسد یا تو میرے سب کچھ سے گئے۔ "یہ آپ کہیں بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سنا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی حاجت کیسے کر سکتا ہوں۔" آپ کی ریاضت اور محنت سے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہر مند ہی آپ کو صحیح راہ سے لے سکتا ہے۔" استاد نے کی آنکھیں غم ہونے لگیں لٹنی نے موضوع بد دیا۔ "آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے، سرنی ہدی راو صاحب کی یہ پہلی فلم ہے۔" استاد نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ "ہاں پر رہا ہے۔" شاید ہی اسے آج اس مقام پر ہیں۔" میں نے لٹنی سے دبے منکوں میں دو پارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی مختار ہے۔ مجھے ان کھیروں سے دور رہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری ہینٹک رکھ دی تھی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہونے تو گیٹ کے قریب میں سے استاد نے در مشتمل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو ہاتھ چلا کر رکشے یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ اتار کے پاؤں میں سے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندروں شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے گزری کے پھاٹک مائیکٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی سے بھی دبے منکوں میں مجھے گھرا آے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی اسے کا وعدہ کر دیا۔ دونوں ہماری گاڑی کھلنے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے لٹنی کی گہری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھا کو پچھلک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سنانے کے لیے اپنی ہادی کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے لٹنی کو فلم کے بارے میں بتا، تو خوشی سے چلائی۔ "فلم۔" ہدی راو میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹر بنوں گی۔ ساری کھاوت میری ملے کر وہ ہوگی، ہر سیٹ پر میری بتائی ہوئی صورتیں ہوں گی، ٹھیک۔" "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر میرے مہر مجھ سے تو کھل کر دو۔ کہیں اس فلم کے جیسے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے۔" وہ میری بات سن کر در سے میں پڑی۔ سنا نے میں ایک شہت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں عمر روہ سا بیٹھا سے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دور میرے کا نام ہوتی تو کتنا چھا ہوتا مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ وہاں ہی پر میں نے ڈائریکٹر کو گاڑی سٹوڈیو کی طرف موڑنے کا کہا تو کیر اپنے پیرے کے تاثر نہ چھپا نہیں پایا۔ "صاحب! جارت رو تو ایک بات



ہوے۔ میں نے چونک کر سے دیکھا۔ "ہاں ہوا۔" وہ انگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھ بیٹھے اور اس کسمپاسب صاحبہ ایہم اسنوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بد سے کا۔" میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی رہاں کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک پڑی تھی۔ ہر بڑا خیر و برے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا تقاضا میں نے جو جس پر تھا، جو دیا کا کوئی بھی ورہ اسے سے دور چاہے نہیں دینا تھا اور غنائیہ بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسنوڈیو کے حاطے میں داخل ہوئی تو حسب معمول چند تو روٹوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد اپنے اور سنبل کے تیار کردہ ڈھتوں پر کچھ گیت گنگنائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیہ سی لگی۔ بھئی نے میری بے چینی بھاپ لی۔ "پری راو۔" تم جو کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے۔" سنبل نے شاعری کے دکر پر چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے

جلدی سے لٹی میں سر بلایا۔ "نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوائیں۔" سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ "اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت جھمٹا عورت ہے۔ دنیا داری سے نا تائیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، وہ سب تو۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ڈائریکٹر نے منہ ہٹایا۔ "دیکھ لیں گے اسے بھی، کوں ساسا حردہ حیا ہو یا مجروح سلطان پوری بٹھا میٹھا ہے اس کے اندر۔" بھئی شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشانی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل جیتے ہیں اس شاعر سے۔ ڈائریکٹر ہلکا سا گیا۔ "رے کیا بات کرتے ہیں سرنی۔" آپ کیوں جائیں گے، وہ خود "اے گایہاں" میں سے اس کی ٹیسی اس سنی کر دی۔ ہم اسنوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ چائیک چند لوگ "شاہ جی۔" شادی جی" کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد اپنے۔ بھئی گے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوش اور عزت سے بنے حان سے ملا۔ گاڑی "گے بڑھی، تو بنے خاں سے مجھے بتایا۔" یہ سید نور صاحب ہیں۔ پاکستان کی فلم غلام سنی اب اس فلمی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی تھپی فلم بن رہی ہیں، "میا جس"۔ گاڑی بنے حان کے اندر میرے محلے میں پہنچا تو میں بھی باپ بٹی کے ساتھ بیچہ آ رہا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے ٹک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے برقی آواز میں کہا "اندرا" چائے صاحب، حزاروں کے دور دروب پر دستک نہیں دی جاتی۔" میں، سنبل اور بنے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے و حد کمرے کے اندر دانیوں کی کمرہ دہی روشنی نے غیر لا جالا پھینکا رکھا تھا۔ بنے اور سنبل کو دیکھ کر میہ پان کی آنکھوں میں ایک چمکی سی ہوائی، "کبھی ہم خود کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں۔" اس کی بھلا گاسی چار پائی پر لینا وہ کم رور سا نو جوان اٹھ بیٹھا۔ "معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہذا۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چمکتی نظریں فوس کر کے میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہو گئی، اور وہ بے تابی سے کھڑ ہو گیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراہی آواز میں بولا "اے راو۔" یہ یہ تم ہی جوتوں۔ "میری آنکھیں ہم ہو گئیں" کیوں۔" یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا کیا صرف جاس و حلیہ بدلا ہے پھر مقدروہی لیے باہر رہا ہوں تا سار۔" وہ روتے ہوئے مجھ سے پوچ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یا ر اپنے دوست کو بھی بھل دیا۔" بنے حان در سنبل حیرت زدہ اور پویشانی سے ہم دونوں کو گلے مل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ تا سار ہی تھا۔ میرے کانچ کے دور کا واحد دوست، جس سے میرے عقد بھگی شاعری کی چنگاری کو وہ دے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے تا سار سے کہا۔ "آپ انہیں جانتے ہیں، یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں پری راو۔" اور میں نے اس کی فلم کے لیے حیرت گارن کرنے کو کہا تھا۔ آپ سے۔" تا سار حیرت سے مجھے نونوں نونوں کر دیکھتا رہا۔ "یہ کیا انقلاب ہے بھیا، یہ سب فحش کہلو کیا میرے شہسوار؟ تو واقعی فحش نکلا۔" میں نے مسک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں۔ اب بھی ہمارا ہاں، اس سونا چاندی جمع ہونا جا رہا ہے راو، وہ کے طور پر دل اتھاسی ویرن اور ناکارہ ہے۔ اب تک۔" وہ راو سے ہنسا۔ "یہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یا رہوتا۔" بنے حان، وہ سنبل، میں، باتوں میں معروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرے چلے گئے۔ تا سار کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ راو راہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی۔ ہوں۔ وہ پیسے سے بہت زیادہ کم راو راہ لگ رہا تھا۔ وہ راو سے میری استاں منتظر رہا۔ اس کے اس پاس راواں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ "یہ فلم نے کیا حالت بنا رکھی ہے تا سار۔" کانچ کا سب سے خوش پوش اور راو راہ لگا پڑا ہے۔ سب حیرت ہے نا۔" وہ چٹکی سی مسکرمٹ کے ساتھ بولا۔ "یا ہے کانچ کے دور میں ہم نے ٹھپ کر با سنبل میں وہی سی "رہ فلم دیکھی تھی" "تک حرام" اس میں وہ شاعر و لا گیت ہم دونوں کتنا متغایا کرتے تھے۔" میں شاعر بدنام میں چلا محفل سے ناکام میں چلا۔ "تو س یا ر یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں، یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "اور یہ پھوہوں جیسی لڑکھن سنبل، یہ اس شاعر ناکام کی کیا گفتی ہے؟" اس نے ایک لمبی سی سر راہ بھری۔ "پہلی ہے، مڑوں کے در کھٹکنا ہی رہتی ہے۔ اب، کچھو، جہیں پکڑنا ہی ہے اور یہ فلم ہی تھے آگے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا۔"۔" تھے میں باہر تھیں کے دور سے پر دستک ہوئی۔ میں نے تا سار کو لینے پر بنے کا اشارہ کیا اور جو باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات سے کھڑی تھی۔ "آپ سے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل۔" وہ رمدھی ہوئی "آوار میں بولی۔" "آپ اسے پھانسی پڑی راو صاحب، آپ ہی سے بچا سکتے ہیں۔" راو راو حد سار اب آپ ہیں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟" کیا ہو تا سار کو۔" سنبل کی آنکھیں چٹک پڑیں۔ "سے کیسے ہے، اور دیکھتے ہیں کہ آخری ایجن پر ہے اس کا تفسیر۔" میرے ہیروں تلے رمن یک دم سرک گئی۔

رحمت ہوتے وقت ہمارے بھئی سے کہا، ”شوگر کی آج میں تمہیں رو بات بتاتا ہوں۔ جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی سے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی۔“ بھئی کی جھلکیں سم ہو گئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ لیکن میرا احوال ساری رات ہمارے کمرے کے دروازے کے آگے ہی بند رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جس عذابوں کا سامنا کرنا ہے، وہ سب مجھ میں، گریب اور خدا ایک ہی جھلکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر عمر بھر کی شناخت



بدلتا کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس بے ر د کو جانتے ہیں، وہ ایک نئے اور اچھے چہرے والے بڑی راد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری ر د نہ جائے ایسے کتنے بے سرو پا خیالات میرے خالی دماغ میں کھٹکتا رہے۔

جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کڑکی کے شیشوں سے بھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمانی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹے ہی ہنسنے کہا۔ ”یہ کیا سر جی! آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی، اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔“ کمانی کے ہاتھ میں صبح کا خبر دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ تو یہ خبر چھپ گئی، یہ اخبار دے جانے اتنی جلدی کیسے ’زنی چڑیا کے پر گس لیتے ہیں۔‘ ابھی تو صرف صوبہ ہی بنا تھا۔ کمانی نے جوش میں اندرونی صفی کھولا ”شہ پارہ بیگم کا پورا اندر دیکھا ہے سراسر اسی فلم اندر سٹری ہا کر رکھ دی ہے۔ آپ نے ابھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا۔“ مگر اب تو فلم دیکھنے کی سہلت ابھی نہیں ملتی۔“ میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمانی اپنی دھم میں بولے گیا۔ ”اس دس آپ نے مجھ سے پوچھا تھا سر کہ شادی کے جسے ماں بعد بچوں اور گھر بار کے مسائل کے بھروسے ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے تو بات صرف محبت کی نہیں ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور جو شیشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غم دوراں کی آمد میں۔ اب یہی فلم یکسر بننے والی خواہش ہی لے لیں میری۔ کاش! میں شادی کے چکر میں اس آدھ کا کھلا کھولتا۔“ کمانی باقاعدہ غم کین ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جانتے ہو کمانی، دیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے، وہ جو اپنے ماضی کے لیے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حاس میں حور کو کو سے۔ تم نے ’کس وقت وہی فیصلہ کیا، جو تمہارے دوسرے بستر جانا۔‘ تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی۔ مگر اس وقت تم فلم اندر سٹری جو اس کر پیتے تو شاید آج ایک نام دور آؤ گے کہہ دتے، مگر یقین کرو، اپنی محبت کھو دیے کی ککک تمہیں آج زیادہ غم کین رکھتی۔ جسے تم نے پایا، بس وہی تمہارے لعیب ہے، باقی سب سراسر ہے۔“ کمانی نے اثبات میں سر ہلایا ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، مگر پھر یہ پایا ہو لعیب اپنی کشش کیوں کھو دیتا ہے۔ حاصل ہی ہمیشہ کشش کیوں رہتا ہے؟“ میں نے لمبی سانس بھری ”شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناٹھکر ہے۔ اور یہی بات محبت کی، تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے، اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفت رفت ہماری محبت، شفقت میں بدل جاتی ہے۔ محبت، محبت نہیں رہتی، ایک گہری شفقت بن جاتی ہے۔“ کمانی نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”شفقت میں سمجھا نہیں سڑ۔“ ہاں کمانی، شفقت ہماری محبت کہیں کھوئی نہیں ہے۔ اس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہم باقی ساری زندگی اس شفقت ہی کو محبت سمجھتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ حلق رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جاؤ کمانی، اپنی ندی تھیں کو اپنا پورا وقت دیا کرو۔ کیوں کہ کبھی کبھی شفقت کا قلم محبتوں کے اودھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔“ کمانی پُپ چاپ دفتر سے نکل گیا

دو پہر کو لٹنی کاٹوں آیا، تو میں نے اسے خوش خبری سنائی کہ سارے فلم کے سارے گیت لکھ کر استاد نے حاس کے حوالے کر دیے ہیں۔ میوزک بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لہذا اگلے ہفتے فلم کی ساری موتیاتی ترتیب دے دی گئی۔ سسل نے مجھے بتایا کہ اس نے میمنوں بعد ناسار کی ”کھوں میں خوشی کی چنگا ہر“ دیکھی، جب اس نے اپنی شاعری پر سسل کی ”و کا جو دیکھتے سنا۔“ لٹنی کی خواہش تھی کہ فلم کے گانے کیپیڈیا یورپ کے کسی حسین مقام پر فلم بند کیے جائیں۔ فلم کی کاسٹنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب صرف شوٹنگ کا مرحلہ شروع ہونا باقی تھا۔ میں دس بھر غیر محسوس طور پر طب کے رسالوں اور انٹرنیٹ پر دنیا کے بہترین پلاسٹک سرجن کی تفصیلات کھوجتا رہتا تھا۔ میرے دفتر کی اماں یوں دیر کے خفیہ دروازے میں معلومات سے بھرے رہتے تھے مگر یہ سب کچھ میں اس طرح چھپ کر کر رہا تھا، جیسے کوئی چور، چوری کرتا رہا۔ پسے مجھے ہمیشہ یہ خوف اور فکر دامن گیر رہتی تھی کہ لوگ میری ضرورت کا مذاق اڑائیں گے اور اب جب ایک راست دکھائی دیا تھا تو یہ دروازا من سے پٹنا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ ہماری زندگی کے ذمے فی صد معاملات کی انھیں اسی ایک جیسے ہی میں تو پہاں ہے کہ زبان کیا کہے گا۔۔۔؟ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم زیادہ تر ان ہی لوگوں کی باتوں کی لگڑ میں گھلے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے درحقیقت ہماری زندگی جیون ہوتی ہے۔

اگلی شام میں یعنی کے گھر پہنچا، تو وہ اپنی کسی سسکی کے ساتھ ریڈیو اشیش کے لیے نکل چکی تھی میں واپس پلٹے لگا تو اس کی والدہ نے مجھے چائے کے لیے روک لیا کمرے میں چاروں جانب میڈیکل رپورٹس اور آنکھوں سے متعلق دیا کے کچھ مشہور اسپتالوں کے کتابچوں کا اسرار لگا تھا۔ بھٹی کی والدہ نے بتایا کہ بھٹی سات ماں کی عمر تک بالکل ٹھیک تھی، پھر ت چائے کیا ہو کہ دھیرے دھیرے اس کی چٹائی جاتی رہی۔ اس وقت بھٹی کے والد مدد تھے اور انہوں نے اپنی ہی ہر محنت کوشش کر دیکھی، مگر بھٹی کی چٹائی واپس نہ آ سکی۔ پھر کئی سال بعد بات یہاں تک پہنچی کہ ”بھٹی کے گروپ سے مشابہت رکھتا ہوا“ سیز (قریباً) مل جائے تو بھٹی کی بصارت واپس آ سکتی ہے۔ بھٹی کی والدہ نے دیا بھر کے بھٹی اور اس کو اپنی بھٹی کے کیس کی تفصیلات بھجوا رکھی تھیں اور اب سسٹم سے اس جوان بہت خاتوں کا کام اس کی بھٹی کے آنکھوں کے قریب کی تلاش کے لیے دیا بھر میں خط و کتابت کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انھیں قسمی دی کہ اللہ سے چاہتا ہوں کہ اس کی تلاش، رنگ لائے گی۔ بھٹی کے گھر سے لگتے وقت میرے دس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر بھٹی کی چٹائی میری سرجری سے پہلے وہیں آگئی تو وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی۔ اس کے من سے میری جوشیہ تراشی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ بیک چھنا کے سے نوٹ کر کر پچی کر پچی ہو جانے لگی۔ کاش! اس ساری دنیا میں کسی کی آنکھیں ہی نہ ہوتیں اور ہم سب اپنی، انھیں کی چوروں سے بیک دوسرے کو دیکھا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر جہاں ”کاش“ جائے، وہاں آخر میں صرف ایک ”آؤ“ رہ جاتی ہے۔ میں نے ابھی ایک لمبی ”ہ بھری۔“ کچھ بھی نہ ہو مجھے کسی بھی صورت بھٹی کی بصارت واپس آئے سے پہلے اپنا سرجری کروانی ہوگی مجھے، پنے چہرے کو بھٹی کے بنائے ہوئے جسم کی شبیہ میں ڈھالنا ہوگا تا کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیا دیکھے تو میں نے ”ی طرح نظر آؤں، جیسا وہ مجھے محسوس کرتی ہے۔ گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میرے اندر میرے اپنے ہی متضاد خیالات کی ایک ایسی بیخار جاری تھی، جس نے مجھے پوری طرح نظر حال کر کے رکھ دیا۔ وہ پوری رات عجیب کرب میں گزری اور پھر آجک ”کر میں سے“ ٹریٹ سے آج شدہ معلومات کے مطابق پلاسٹک سرجری کے تمام اداروں کو ای میل کر دیں، جن میں اپنی تارہ ترین تصاویر اور باقی تمام تر نیات بھی تحریر کیں۔ دوسرے دس ہی سے مجھے مختلف اداروں سے جوابات محسوس ہونا شروع ہو گئے اور میں دن بھر ان جوابات کے انتظار میں رہے۔ مجھے اپنے مطلب کے ادارے کا انتخاب کرنا آسان ہو گیا، فوراً تو کے ایک طبی ادارے سے پلاسٹک سرجری کے لیے حور کو ڈھیر کر لیا تھا، اس پر کبھی ایک سطر سے مجھے سے پٹنے پر مجبور کر دیا۔ جس کی تحریر یہ کچھ یوں تھی ”ہم چاہتے ہیں کہ بد میں، ہر چہرے بد میں دیتے ہیں۔“

میں نے پائن ہل (Pine Hill) نامی اس پلاسٹک سرجری کے ادارے کی تمام تفصیلات، کٹھن کیں اور پھر اس کے سربراہ ہال جوڑ کو ساری تفصیلات لکھ بھیجیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہال کا جواب آ گیا کہ ان کا ادارہ بنیادی طور پر آگ میں گھلس جانے والی کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے اصلی خدو خال کھو بیے والوں کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ اور میرا کیس اس کے ادارے کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں نے پال کو دوسری ہیبل بھیجی کہ کیا اس کا ادارہ محبت کرے والوں کے خوب پورے نہیں کر سکتا؟ میں بھی تو تقدیر میں، صرف چہرہ بد سے کے خواہش مندوں میں شامل ہوں۔ اور گروہ چاہتے ہیں کہ میں



پنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کھٹکھٹا کر ان کے اوارے کی شرط پر پور ترے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موندیں۔ صبح سویرے پردوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے اس باکس میں لایاں تھی۔ میں سے جدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے اوارے کے "ڈیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے والی پتے سے بھیجی تھی" یہ میل میں اپنے والی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل سے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جد والی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے، ڈکے، اگر تمہاری یہی ضد ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ ہماری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا دور وہ ہر حال ہے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری نمینٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پینے تم پے ٹنک کے کسی مستند ملٹی اوارے سے یہ ابتدائی نمینٹ کرو کر مجھے بھیج دو۔ مگر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی تو میں تمہیں اطلاع کروں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی انٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا قلم، ڈاکٹر پال جوہر۔" میں نے میل پڑھ کر ایک بی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت ملے ہوئی تھی۔ اور سوچا ہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت ملے ہوتا ہے جد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو لکھا پھلکا محسوس کیا۔ سانس رکنی میں بہت سے بوجھ اٹھاتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، فکر کا ہونا ہے۔ دفتر پہنچا تو لکھی اور ڈاکٹر پال سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لکھی نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں ہماری دس چھٹی نہیں رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شے پر میری راقی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ہم بہت جلد گاؤں کی فلم بندی کے لیے کیپٹن رو۔ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے، میں نے سوچا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گاؤں کی فلم بندی کا بنا کر یونٹ کے ساتھ کیپٹن چلا جاؤں گا جہاں میں چار مہینے ملاج کے لیے رکھنے کا کوئی دوسرا ایسا مہونڈا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ مہر کرنا ہی تھا۔

اس وقت میں چاہتے ہوئے بھی سرجری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم سانس بہت کوتاہ نظر اور بڑے ہیں ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دس کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں پڑے میں دورہ ہر برہمی نابل ہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سرجری کروالوں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک دور روزانہ کے پتے، ہسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے ملٹی تجربے بھی کرو لیے تھے، اور اب مجھے ان کی رپورٹس سننے کا شدت ہے۔ انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد غصے کے گھر جانے کا کوئی خاص بیان نہ ہونے کے باوجود میں بیٹے میں ایک آدھ پکڑ اس کے گھر کا مصروف لگا بیٹھا تھا۔ کچھ گلیاں اور کوچے اپنی سمت جانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جاے وہ من موٹی ہی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے برج سے پر ہناقتہ ہوا بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دن کے کوڑا سو کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دس ہمیشہ کسی قلمس درمیان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے دھنستے وقت اچانک فون پر سسل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "آپ جلدی سے شوکت خام ہسپتال پہنچیں۔" آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں سب چھوڑ چھاؤں کر کبیر کے ساتھ ہسپتال کی طرف بھاگا۔ رواداری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سرموں کی طرح چین پڑ چکا تھا۔ اس سے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے، کچھ کرٹنگ سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے یہ مشکل مسکرایا۔ رستہ روک رہی ہے، قصوری جاں ہے والی جاے ٹوٹے دس میں آیا رہا سے باقی جانے بھی دے اسے دس۔ سب کو ہیرا سلام میں چلا، میں شاعر بدنام میں چلا، محفل سے ناکارہ میں چلا۔ "میں نے ٹک کر اس کا ہاتھ تھام لیا" انہیں بس چاہے ہو تم رستہ سے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جاے دس گا۔" اس کے سر ہانے کھڑی سسل اور استاد بے کی "تکھوں سے آسو ٹک رہے تھے۔ وہ مشکل آنکھیں کھول کر بولا "دیکھا ہی راد پیارے، یہ تو واقعی ہی فلم کا سین بن گیا۔" لگتا ہے، جیسے میری کہانی، ریکٹر نے تمیں چاہیں سال پہلے فلم دی تھی، مگر بارہ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ حال تو نکلتے نکلتے حال لگاں والی ہے۔" میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا "پتہ ہو جاؤ، خود کو حال مت کرو۔" "میں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری تسکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔" ناساز نے سسل کی طرف دیکھا "یہ کہانی بھی دھوری روگنی دی رہا ہے میرے جاے کے بعد میں باپ اپنی کا ہر احوال رکھنا، اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائل میں میرا نام "ناساز بولنے بولتے چائیک ہاؤس ہو گیا۔ میں نے گھر کر اس کا چہرہ تھپتھا یا "ناساز" پتہ کیوں ہو گئے، بولتے کیوں نہیں تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں چاہتے، بولو، بے وفا، دعا ہار کچھ تو بولو۔ بات کرو "میری جینیں سارے ہسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بے نے ہسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے لیے جان جسم سے دور کر دیا۔ میں لیٹا چلا تارہ گیا۔ استاد بے نے دیوٹی کر مجھے گلے لگا لیا "پتہ کر جاؤ" ناساز اب کبھی نہیں بولے گا وہ مر چکا ہے۔"

پہلے ایک چھتے قدر سے خشک ہونے پر اس کو روغنِ بادشاہ سے لپیٹ کر ایک گھنٹے کے لیے فحش کی کھڑی ہے جسے ایک کم صورتی کے عجیب سے لباس میں پہن کر پتہ نامہ کے مستطورتہ کے طہیتہ نشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے متعلق پتہ نامہ کے کتبہ کے پڑاؤں پر نامہ

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں بہت دیر اس نے گھر کے دورے پر کھڑا کر اپنی بھتیجی سائیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے جس کی جدالت میں یہ میری پہلی فحشی ہے۔ دوسری کھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ ابھری اور میں منہ نہیں کر کھڑ ہو گیا۔ گل دستان پر میری گرفت خست ہو گئی، اور پھر دروازہ کھلا تو میرا ہاتھ دھڑکی میں بلند ہو گیا۔ ندر سے نکلنے والے نوجوان میرے لیے قطعی اچھی تھا ”جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ میں سے دیکھتا رہ گیا، سبابت، کھنٹی رنگت، بکھرے بکھرے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عیب کی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ دھابت کا پیکر تھا۔ وہ خوب رو، با اعتماد اور غرور سے لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستان والا ہاتھ میکائیلی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑ کر اس سے پوچھا ”تم کون ہو؟“ وہ لڑکا جس پر ”لو، دو بھی ہم سے پوچھتے ہیں“ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری ماں کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نارس ہو ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟“ میں نے اپنے ڈوتے دس کوسہال۔ ”میں بھی کا دوست ہوں، مہدی رحمان ہے میرا۔ عدنان سے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پیسے لفظ کو کافی مبالغہ کرنا ہو رہا تھا۔ ”چھا۔ تو آپ ہیں مہدی رحمان گریٹ۔“ سر کھلایا سے اس پاگل لڑکی سے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے۔ بچے مانوس، تو میں آپ سے جیسے ہو رہا تھا۔“ میں نے گھر کر اس کی طرف دیکھا اور دور سے اس پر۔ نہ مت مہیے گا مہدی کی عادت ہے میری۔ عورتیں ناں۔ باہر کیس کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی عورتی ہیں۔“ میں چپ چاپ اس کھنڈر سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں پکڑ لیا گل دستان جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دستان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آگئی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ”مہدی آپ آگئے مہدی رحمان۔ دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا آئین عدنان۔“ بچے جانیں، اس بالائی کو کوئی کر دور بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا حرکتیں تو بھی تک وہی گل کے آواز دلاؤں جیسی ہیں اس کی۔ عدنان سے رو رو دار قبضہ لگایا ”تو تجلی کا لڑکا جی تو ہوں۔“ تباہی گل کا ایک آواز، جو گھنٹوں دوپہر میں تباہی کا بج سے اپنی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں مہدی ”وہ دونوں زور سے مس پڑے، چائے کیوں ٹھیک؟“ اسی سے میں نے خود کو دبا دے حد جنسی سانسوں کی بکلی تک یہی دور و دور مجھے کھنٹے مانوس، کھنٹے مہریاں سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک جنسی کے آواز سے میں غور بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی لینڈ میں اسپیشلٹز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ سی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تباہی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت لٹا لئے میں خفا ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کر کے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باور پنی حاس میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنسنے لگے۔ میں نے عدنان کو ٹوکا ”بس بس۔“ ”بہتے دو یہ تاریخ دہائی کی باتیں، خوب چاہتی ہوں میں کہ جناب کڑی دوپہروں میں کس کے لیے دھوپ چاہا کرتے تھے۔ کیا عام تھا اس عینگی کا۔“ ہاں، نگہب اور وہ دوسری بھتیجی، مددش اور وہ تیسری ”عدنان نے جلدی سے، اے راکا۔“ اوہو، اس بھی کرو، وہ پچھتا تھا میرا۔ اور سی دوچار معاشقے مہاراجہ دوستیاں تو کبھی کرتے ہیں لڑکیوں میں۔ کیوں مہدی رحمان صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ سوچ تو پائے ہوں گے، اس غم میں آپ نے بھی۔“ میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ”میں ڈاکٹر صاحب! احوب پانے کے لیے مید کے کچھ خوب صورت



”پائے“ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک مید کا وہ ”پانا“ ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ مید آجائے تو شاید کبھی خوب بھی پال سکوں۔“ عدناں سے چونک کر میری طرف دیکھا ”واہ، میری بھاری کڑن یونگی۔ آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے۔“ میں اٹھ کھڑ ہوا۔ آپ میں جاذبہ چاہوں گا۔ ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔“ وہ دونوں ہونکھ سے گئے۔ یہی جلدی سے ہوں اور سے ”آپ کہاں چل دیئے، انہی سے کھانا لگا دیا ہے اور آپ سے تو آئے سے پیسے فوب پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں۔“ ”عدناں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بتائی، اور سے ہاں، یاد آئے، فلم کا پونٹ کیسٹ جارہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں۔“ یعنی حوشی سے چلائی ”واہ ربروست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمن ناں۔۔۔ یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب۔“ میں نے چونک کر بیٹنی کی طرف دیکھا ”کیوں؟“ عدناں نے جلدی سے فعل دیا۔ ”ہدی راد صاحب۔ آپ ہی سمجھا نہیں اس لڑکی کو۔ میں نے امریکا کے ایک بڑے ملٹی ادارے سے میسج کی ”تکھوں کے میچنگ“ سڑکی بات کی ہے، وہ لوگ فوٹو فی صوبہ امید ہیں کہ وہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قریہ بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل ہاجر کے ملکوں میں عموماً سڑنے موت کے قیدی یا ستر مرگ پر پرے مرلیں اپنے اعضاء مرنے وقت دال کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے یعنی کے میچنگ سڑنے کے لیے، ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے، وہ وہ لوگ قریہ ملے ہی میں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ وقت میں بیٹنی کی غیر موجودگی کی وجہ سے، ہمیں دیر ہو جائے۔“ بیٹنی نے جتنی بچے میں کہا۔ ”خواب دیکھنا چھوڑ دو، مائی ڈیزیز کرن ڈکڑ عدناں! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی۔“ کھوں روپے چاہے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ لگ۔ کہاں سے؟“ میں گے اتنے روپے۔ اور تم یہ بھی جیسی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے چنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سو موور جٹ، اوکے۔“ ”دو دونوں بچوں کی طرح جٹ کرتے رہے۔ میں نے میسج سے جاذبہ چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے رستے ان دونوں کی ٹوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدناں کو بیٹنی سے بے تکلف ہونے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھٹتی جا رہی تھی۔ مگر خود بیٹنی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی۔ صہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے حوصلے کی گزشت کیوں تھمتے لگتی ہے۔ کانوں جیسی شخص اور تک ہمارے وجود کو کیوں چھنتی کہہ سکتی ہے؟ کیا اسی کو رقابت کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر کہ نہیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان بوا آ رہا ہے۔ اگلے روز نئی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک چوٹکا جاتا۔ مگر یہی تو جیسے عدناں کے آئے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے جڑ جڑا ہٹ سی ہونے لگی اور میرا عمل اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمانی سے یہ بات ٹوٹ کر ان اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں نے کیا بتایا، مجھے تو خود بتا نہیں تھا کہ میرے در کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ ”میس قراۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں“ تو ایک لمحے میں ساری بے چینیوں، ساری سے تائیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں تیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدناں بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہستہ بیٹنی ہی وہ ناراضی سے بولی ”کہاں غائب ہیں آپ، عین دن سے۔ کوئی فون۔ کوئی خبر۔“ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان نہیں چھی طرف۔“ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدناں نے مسک کر میری طرف دیکھا ”بڑی جلدی ہے یہ بیٹنی سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟“ میں نے گہری نظروں سے اس شخص ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ لوہو کا ایک ہالنگ رہی تھی۔ ”چلو کچھ جرم، ملے کر دو، میری حیر حاضری کا۔“ ”تحرکار، بات یوں ہی کہ مجھے ناں دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور دین ڈیزائنسٹور میں مدعو کرنا پڑا۔ عدناں نے جاتے وقت بیٹنی کے کمرے سے لگتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ بیٹنی کے یہ میچنگ میسز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر بیٹنی جاسے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدناں نے وہ بے تکلفوں میں مجھ سے رات کو میسج کی درخواست کی۔ وہ ”پنا“ بولی گھر بیچ کر بھی کا عدناں کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جاے کے بعد پھر سے وہی ہراسہ شے ہزاروں سے، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری محبت ریت کے دروں کی طرح میری منٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو رستوران کی ٹیبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے کھل کلتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسے دو غنوں کا جواز ہو۔ کوئی ہم تنہا کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتے تو اسے میر وجود ہی ضدانی لگتا۔ عدناں کی کوئی فون کاں آئی تو وہ اٹھ کر وہ فاسٹ پر چلا گیا۔ بیٹنی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ ”آپ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں ہدی راد۔“ آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم غم سے ہیں۔“ ”نہیں، اس کی کوئی بات نہیں، تم عدناں کی بات مان کیوں نہیں بیٹنی۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کہہ رہا ہے۔“ بیٹنی نے اسی ”ہجری“ ”چھا۔ تو ڈکڑ صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر آج کل چاروں طرف مجھے ہی کا سحر محسوس ہوتا ہے۔“ بیٹنی اس وی۔ ”ہاں، ٹھیک کہہ آپ نے، پتا ہے ہدی راد میں نے سات سات کی عمر کے بعد عدناں کو نہیں دیکھا، جاے اب کیا دکھتا ہوگا۔“ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اتار جاتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی سے حال سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں ہدی راد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری چٹائی والٹس آئے،

میں سب سے پہلے عدناں ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک درہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں ہدی راد۔ اب میں عدناں کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میرا دس چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں میرے اور کوٹے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دی ہو۔ دیکھے جاے کے قابل صرف عدناں ہے۔ سنے میں عدناں بھی وہاں پہلی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ ”خدیجی راد صاحب! کچھ آیا اس بلی کی مٹل میں یا نہیں۔“ سے سمجھا نہیں کہ ہوں کے صوفوں کو یوں ٹھکر یا نہیں کرتے۔“ بیٹنی نے احتجاج کیا۔ ”نہیں باب، نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے بانی گھر کے علاوہ اور سے ہی کیا۔ در پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بیٹنی سے بہت زیادہ ہم ہیں۔ میں ہو گیا فیصلہ۔ تم دو گھر کبھی نہیں چھو گے۔ اور اگر کبھی تم سے اب کیا تو ساری رات کی مجھ سے بات مت کرنا۔“ عدناں نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، میں نے اٹل اندر رہی کی ”تم دونوں خواہناؤں ٹھنڈے ہو۔“ عین پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی در رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ بیٹنی کے علاج کا تمہارے چہ میں بدوشت کروں گا کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔“ ”نہیں ہدی راد، ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں سے رمدگی میرا ایک ہی خود اداری کا بھرم ہی تو کہنا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عمر بھر کی یہ واحد کئی بھی نہیں دینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ وہی بیٹنی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عمر جھکی رہے۔“ ”ہاں، آپ ایسا نہ کریں۔“ میں سے بیک گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو میں ہی سہی، مگر پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ میں پھر تمہاری خود اداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارے علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہذا میں سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کئی خان عدناں کا آپائی گھر میں خریدوں گا۔ مکان کی رقم سے عدناں تمہارا علاج مکمل کروئے گا لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدناں کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدناں جب بھی رقم جمع کرے گا مجھ سے پنا مکان وہاں سے لے سکتا ہے۔“ بیٹنی سے بے چینی سے پہلو بدڑ۔ ”نہیں۔“ کوئی اگر مگر، لیکن نہیں سنوں گا میں، میں ملے ہو گیا۔ تم لوگ جاے کی تیاری کرو، آج کل ویسے بھی اچھے کڑوں کا کاں پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدناں کچھ ہی برس میں پنا مکان وہاں حاصل کر لے گا۔“ عدناں نے حوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی حل نکالیں گے۔“ آپ واقعی کمال ہیں ہدی راد



اس وقت تو یعنی خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا فسر میرے موہاں فون پر جھگڑے لگا، بڑی ر د میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔“ میں نے بات مذاق میں بنائی۔ ”نہیں بے وقوف لڑکی انھیں نہیں بتا کہ پر اپنی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر نے لڑکیوں میں نے کوئی گھٹنے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ بیٹا، عدنان رقم چکا۔ سنا تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے پری راؤ کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟“ وہ اس پڑی۔ ”آپ ہمیشہ گھٹنے کا سودا سے ہی کرتے ہیں۔ میں ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دیا روہا رو دیکھوں تو میری پہلی نظر کے حرم میں آپ کو ضرور مودود رہنا ہوگا۔ بوسیں، قبوس، بے تو ٹھیک، اور نہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات۔ نوے آپ کے لیے۔“ میں نے جلدی سے حائی بھری۔ ”ٹھیک ہے صدی بڑی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی ہمارا مست کرے؟ جیسے تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔“ میں نے یقینی تو تو تسلی دے دی، مگر خود میرا جیس دسکون ہمیشہ کے لیے ہو ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر ناں میں ٹھہرتا رہا کہ ”کھیں مل جانے کے بعد یعنی جب مجھے دیکھ لی، تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔“ صبح سویرے عدنان ابے گھر کے کاغذات بن کر آئے۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو حوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جاسے لگا تو میں نے سے آو رو سے کر دیا۔ ”سودھان“ وہ پٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ”یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف فی کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈر کیا تھا، یعنی کی آنکھیں وہاں آج میں اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا ر یعنی کے لیے ہمیشہ رہا رہے گا۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہوئے تھیں۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پری را د صاحب! میں دس رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔“ یقین چاہیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی۔“ میں نے اس کے کا دھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی۔“ عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پٹا۔ ”آپ کو میں ہر سیکے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم گئے مفتی ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر یعنی کی آنکھوں کی جتنی کھینے سے پہلے آپ کو بھی مر کا ہانچنا ہوگا، اور وہ صدی لڑکی پریشن ہی نہیں کروئے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس سے آپ پریشن کے لیے“ ہاں“ بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے۔ میں نے عدنان کی آنکھوں میں نارے سے ٹکراتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار س کی آنکھوں میں تب دکھائی دیئے تھے، جب وہ یعنی کا کر کرتا تھا۔ ”آپ جاتے ہیں پری را د صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن یعنی پہلی بار یہ تقریب دنیا رکھیگی، میں اسی دن اسے شادی کے لیے پروپور کر دوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔“ میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ”کیا میرا مطلب ہے کیا یعنی کو بھی اس بات کی خبر ہے؟“ عدنان نے جیسے حویں کی ہستی سے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اسے اپنا اہم سمجھتا تھا پتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپور اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مراد مال اور میری حاکم کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ میں اب وہ دن بھی قریب ہے چلتا ہوں، بہت سے کام انھوں سے پڑے ہیں۔“ عدنان پٹ کر چلا گیا۔

میرا نر بڑی طرح چکر رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمانی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں سر۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کمانی! میں گھر و جس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔“ میں دو رو سے تک پہنچ کر ڈک گیا۔ کمانی ابھی تک گم صم سا کھڑا تھا۔ ”کمانی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت لوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟“ کمانی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں سر! حوش قسمتی سے رقابت کا ر ہر میں نے کبھی نہیں کیا۔ مگر سنا ہے کہ محبت کی اصل روت بھی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے۔“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمانی سے پوچھا۔ ”رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمانی؟“ ”رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ لکھ نہیں ہوتا۔“ میں نے چونک کر سے دیکھا۔ ”لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جنگ نہیں۔“ کمانی مسکرایا۔ ”محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بعد در کیا ہوگی اس ویسا میں سر۔ اور آپ نے سنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جا کر ہوتا ہے۔“ میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا ر ہر میرے پورے وجود میں پنے پنجے کا زنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دس ڈھلا، اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو تالا لگائے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ ”کبیر جان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“ کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”ہم جاں لے سکتا ہے اور جاں دے بھی سکتا ہے صاحب۔“



مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اس روز ہو۔ تیسرے دن فلم یونٹ کیڈارواں ہو گیا۔ میری بے چنگی بھی اپنے حروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پتلی یا پری راؤ مجھے دس بھر کچھ کے گاناں بتاتھا۔ رقیب سے رقابت درد ضمن سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کرے جائے وال تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پری راؤ، میں کی آنکھوں کا آپریشن کرواے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پسے اس عدالت نامی کانے کو نکل جائے دو۔ کاش میں کو کبھی پٹائی ہی نہ مل پائے۔ پری راؤ کے لیے تو اس کی کومل روح کی چاندنی ہی کافی ہے۔ مگر بھر جالا کرے کے ہے۔ اس کی پٹائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرے وال احمق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس نکرہ کی گونج سے، درد سے پھٹنے سر کو تھم لیا۔ 'ی وقت کبیر حان کسی کام سے دفتر میں داخل ہو، تو میرا روجہ اور پیسے سے شرابور وجود کچھ کر گھبر گیا' 'کیا ہو صاحب' 'سب خیر تو ہے؟' در شاید ٹھیک ہی ہو تھا جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔ 'کبیر حان' 'اور تمہارے علاقے میں گر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو؟' 'ہم اس کو قتل کر دیتے صاحب' 'اور علاقے میں محبت اور غیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے'۔ میں نے ہی آنکھیں رو رو سے بھیجی ہیں۔ 'کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر حان۔ اس کو بھی ختم کر دو' 'کبیر پنے بیٹے پہ ہاتھ رکھ کر جبکہ گیا۔' 'تم صرف اس کا نام بولو صاحب' 'چونکہ میں وہ اس دیا سے چلا جائے گا'۔ میں نے ایک کاغذ کے رختے پر عدالت کا نام اور پتہ لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ 'یہ لڑکا سچ کل رہا وہ ترمیمی لی بی کے گھر ہی پر رہتا ہے۔ دھیاں رہے۔ یہ کام تب ہو چاہیے، جب وہ لڑکا تنہا ہو'۔ کبیر نے سر جھکا دیا۔ 'پ نظر مت کرو صاحب۔ ہم سمجھ گیا'۔ کبیر کسی جیسے وقادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی دیکھ چلا گیا۔

میرے بیٹے پر رکھا ایک بھاری پتھر بنا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سہل پورے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر تیار نہ ہو کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو نوگ مل بھر میں میگزین گھر جاز دیتے ہیں اور پلٹ کر دور رک کر دیکھتے بھی نہیں میں تو پھر بھی صرف اپنے دس کا تنگی آباد کرنا چاہتا تھا کب چاہتا تھا میں نے کہ ایسا ہو، مگر ایسا ہو رہا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے کچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزد کمر کر کر دیتا ہے۔ میں تو وہ بے سہر تھا کہ رٹکی کو ٹکی کی طرح او کر سکا۔ ورنہ گناہ کو گناہ کی طرح نہ پاتا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا بھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال طرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ دس دن ملک رو آگئی سے قبل اپنے جیسوں کی ایک ٹرینش رکھ چکی ہے، جس کا تاج ہی افتتاح ہے۔ فہد میں دفتر سے یہ حاشیہ کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا جیسے عدالت کور سے سے بنائے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ میں بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں الجھی رہے گی اور کبیر حان کو دور کرے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چوڑیاں سی رہ گئے تھیں۔ جرم کی جی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر رہتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری ہو گوں سے کچھ بھی بھری ہوئی تھی۔ کون بھی دفتر میں میں کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ قریب کا مہمان خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرنا رہ گیا، مگر جھٹ پیت کانے والی قہقہے میرے ہاتھ میں ٹھنڈی گئی۔ فیت کتنا تو تائیوں کی گونج میں ہم اس ہاں میں داخل ہو گئے، جہاں میں کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے میں نے پھر نظروں سے دھڑا دھڑ دیکھا، مگر مجھے عدد نہیں دکھائی نہیں آیا۔ یہ ہی میرے اس کے چورے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں میں سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی انگلیوں کا ٹکڑا سارے ہاں میں بکھر ہوا تھا اور اس کے من کا جادو سر چڑھ کر ہوں رہا تھا۔ ہو گوں نے بی بھر کر سے داؤ دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خاں کو ہاں سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑ تھا کہ ایک نئی ٹھنی سی ٹری کی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ 'کیسے ہیں پری راؤ صاحب، کبھی عربوں کو بھی یاد کریا کریں۔ آپ نے خوش پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیر دس کو دیکھا تک نہیں' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمان نے جلدی سے تعارف کر دیا۔ 'مریہ میڈم زاراچی۔ شہ پارہ کی فکر کی بیروئن ہیں'۔ زارا نے انگاری سے سر جھکا دیا 'کہاں جی' شہ پارہ کی فکر کی ہوتی تو آج میں بھی پر ر اور صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر ایسوں سے تو میں پوچھا تک نہیں'۔ کوئی در موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدالت کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان بھڑے کے لیے کہا 'گر میں نے کوئی دوسری فلم بتائی، تو آپ کو ضرور موقع روں گا۔ فی الحال میں کسی اور بجھ میں ہوں۔ معاف کیجیے گا'۔ کمان نے میرے بٹنے کے بعد جانے بات سمجھنے کے لیے اس شخص بے پرو کو کیا کہا میں بہت کرا ایک جانب کھڑ ہو کر بظاہر ایک مس پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمان ہاتھ میں ایک تعادلی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ 'سر! یہ راتے پنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا' حاس' 'میر بھی لکھ دیا ہے۔ اسے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی؟' وغیرہ کریں'۔ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروئی سے کمان کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیرت ہو۔ 'تم جانتے ہو کمانی مجھے ایسے ہو گوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ جس جب خود اپنی قیمت لگا۔ پر مل جائے تو یہ ایک وقت اس سے زیادہ گراں اور ارادیں جس رہے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی'۔ کمانی ٹسکر یا 'یہ آپ ہی ہیں، جو اس جس کو رادیں سمجھ رہے ہیں عروہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امرا، اسی رادے کے ساتھ چلا یا تو پر در واد وقت گرا رہے کے لیے جانے کیا کیا جس کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب شخص اپنی قیمت لگانے پر آجائے تو اس سے متعلق چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی'۔ میں نے سر جھکا 'دو شخص ہی کیا جو یک جائے'۔ 'ٹھیک کہتے ہیں سر آپ، مگر بات اگر سودے باری کی ہو تو شخص کے پاس دیاں کرے کے لیے سب سے بڑا عطیہ شخص ہی تو ہوتا ہے۔ شاید آپ جیسے بہت مقدس جس سمجھتے ہیں، رادہ اچھی، ارادش کے ہاں وہی سب سے 'سان سوا' ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے سر۔ کسی کے لیے دوست کے ایوارڈ دی کاغذ کے ٹکڑوں جیسے ہیں تو کسی کے لیے حسن اور ادا اس روٹی کا نعم البدل'۔ 'سننے میں دوسرے ہاں سے ہانپکر پر تقریب شروع ہوئے کا غلام کیا گیا۔ سارے مہمان ہی مشتوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی رو میں اپنے نام دانی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاسوں میں مصروف عدالت پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ تو کبیر خاں مجھے ہاں کے دروازے پر جا کھڑ نظر آیا۔ میری اس سے نظری، تو اس نے 'آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔



جیسے کہہ رہا ہو کہ "پہ لکر۔ کریں صاحب۔" آپ کا عام موجودہ نہیں۔ میں نے بھی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آکر کچھ کہے کو نہیں کہے گی، کیوں کہ میری طبیعت اس وقت جارت نہیں دے رہی، لہذا قریب کے ناؤنسرٹ سب سے پہلے میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضریں کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود مختلف فن کے ماہرین کو اس پر بلایا جاتا رہا اور وہ بھی کے فن کے بارے میں ہنسی دے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ "کن خیالوں میں گم ہیں پری راو صاحب؟" میں عدنان کی "دار" کر اچھلی ہی تو پر۔ مجھے لگا، جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دھن میں بوئے گیا۔ آپ جانتے ہیں پری راو، اپنی بہت خوش ہے، جاسے کیا کیا منصوبے بنائی رہتی ہے ساروں کہ جب اس کی چٹائی دہائی آجائے گی، تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کا، سکول، محلہ، مٹھی، سڑکیں اور گھر دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ، جہاں سے اس کی کوئی یاد بخیر ہے لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیئے۔ میں نے بھی جینے کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب بھی کی بصرات واپس آجائے گی، تو اس کے نصیب کے برابر میرے کوروشی میں بدل دوں گا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہو گا پری راو صاحب۔ اصل میں یہ آپ ہی ہیں، جو ہم دونوں کی زندگی میں فیض کر آئے ہیں۔" میں گم صدمہ ساعدہاں کی باتیں سن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں میں کا نام پکارا گیا ہال میں تائیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈانس تک پہنچی تو ماسا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے سر بکھیرے گئے۔ "آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے تمام درفن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مداح سرائی تو مجھ جیسی سرائی آرٹسٹ کا خوب ہوتی ہے۔ مگر اس سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے۔ ایک امر ہے میرے

یہ کہ میرے محسن میرے "پینڈل"۔ آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح پہنچا ہوا ہے۔ کیا اس آپ سے ہائی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری پریس سے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اس وقت مجھے اس سفید چھتری کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوگی اور یہ سب بھی میرے ہی محسن کی بدولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جس سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنہوں نے قدم قدم میرے حوصلہ بڑھایا اور مجھے جیسے کی راوی دکھائی، محراب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا صحن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورے یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھریے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بھاری دیکھ رہے ہیں یہ سب ہی عظیم ہستی کی دیں ہے۔ دی جو میرے محسن، میرے "پینڈل" اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے۔ سارا ہال بھی کی تقریر ختم ہونے پر تائیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کال پڑی اور سنائی نہیں دی، لیکن ہاں کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ دیکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے پتا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے درگے آئیے میں دوسری جانب کھڑا پری راو مجھ سے پیچ پیچ کر کہہ رہا تھا "تم ایک خود غرض انسان ہو پری راو۔" کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی غلی ظرف ہے وہ کہ تمہیں اہتمام دیتی ہے، مگر تم "تم اس ماں کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیا ور نکلے پری راو۔" خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا تن میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری راو۔" میرے اندر کی "دار" اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گہرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور ٹھیک کسی لمحے اس کی مدغم اور سنائی دی۔ "پری راو۔" کہاں بچے بیٹھے ہیں "پ" میں "پ" کو سارے ہاں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" میں نے گہرا کر عینی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے عینی کو کامیاب دانش پر مبارکباد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ "ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔" عینی اس سے برا بھلا نہیں کہہ رہا تھا۔ تم بناؤ، تم بناؤ، تم خوش تو ہونا "آج تم بے یہ معرکہ بھی سر کر رہی ہو۔" عینی جس پڑی، وہ بہت ملکی پھٹکی سی لگ رہی تھی۔ "جناب! یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ پتا ہے عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ "پ میری زندگی میں میری لگی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں سے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں خوش صبحی کا ستارہ؟" عدنان کے دکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ دیا اور میں نے گہرا کر دھر دھر دیکھا "مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟" عینی مسکرتی "پتا نہیں، کہہ رہا تھا مجھے کوئی سر پر لڑائی چاہتا ہے۔ شاید ہی سسے میں باہر گیا ہے۔ اس آتما ہی ہو گا۔" میرے ہوش اڑ گئے۔ عدنان تمہا پر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی اور اس کے دس بج رہے تھے۔ میں نے عینی کو دھیں رکھے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب پکا۔ میرے سارے مددے شاید آج ہی درست ثابت ہوتا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گہرا کر دوسرا گاڑی مستعد کھڑے تھے۔ میں نے بڑبڑائے ہوئے جیک میں ان سے پچھا "کیر خان کہاں ہے؟" ڈرائیور نے اوپ سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جا کے لیے اس نے گہرا کر دوسرا گاڑی طلب کر لیا تھا۔ اسی گاڑی نے مجھے بتایا کہ کیر خان کسی پرنسپلٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولے گئے۔ یقیناً کیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تاکہ موقع پا کر سے ختم کر دے۔ میں نے کاہنچہ ہاتھوں سے کیر کا ممبر ڈاکل کیا۔ کھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ گہرا کر دوسرا ممبر کی تیز بروں جیسا شور مچا نہیں رہا تھا۔ "فون اٹھاؤ کیر خان، آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہ کیر اور مرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کیر۔" خدا کے لیے فون اٹھاؤ۔" میں نے خود کلائی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کیر کا ممبر ڈاکل کیا۔ تیسری کھنٹی پر اس نے فون اٹھا دیا۔ میری آواز کانپ گئی۔ "تم کہاں ہو کیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ۔" دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ "ہم شکار کے پیچھے آیا ہے صاحب، تم لکھت مت کرو، اس وقت ٹریفک ہمارا اٹھانے پر ہے۔" میں نے چیخ کر کہا "نہیں، کیر خان! یہی لفظی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آ جاؤ۔" دوسری جانب کیر کو میری آواز ٹھیک ہمارا اٹھانے پر ہے۔ "بہت شور ہے صاحب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے۔ وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا اٹھانے پر ہے۔ اس ایک منٹ اور۔" کیر کی "آواز کٹ گئی۔" میں اتنی رور سے چلایا کہ ساری پارکنگ میری "دار" سے گونج گئی۔ "تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کیر خان! یہ میرا حکم۔" میری آواز درمیانی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی "دار" سنائی دی۔ شاید کسی نے ٹائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا

ماہمہ دم کو جوں مل کے پسیدہ و صفت سے محروم و مسرور رہا۔ سناں کار میں۔ نہ کہے ناہ۔ حد + محبت۔ رنجش کا صنف۔ میں لاقی پر۔ نہ حاصل کی تو جنگ سدے ٹیکر یہ میں شاک ہو۔ وئے ناہل عبداللہ کو بھی وقت کے پسیدہ وریں نادب ۱۹۵۹ء حاصل ہوا۔ انہیں رانی اب خدمات پر حکومت پاکستان سے تعویض کار۔ کی سے نور۔ بیہ فہم کے شے میں عبداللہ کی ایب میں اتاق کی فہم کے تخلیق کار کی حیثیت سے مگی قدم رکھ چکے ہیں۔

پانی رانی ایک چھوٹے جسم میں اور قدر سے مشکل مہمیں پانی بہت اس قدر رانی تو رے یہ ایک بے فہم میں تھا۔ جسے کہ مصروف کے عیب سے جب اس طام پسند پرست ہونے کے وقت دوستوں و مدینتوں میں کو سامنا کرنا پڑا۔ سناں سے متعلق پانی سے گوارہ نامہ صفت ہوئیے گا۔ ادارہ پانی پانی ہے

یہ ہے "معدے شہر میں رانی نامہ جنگ شہر میں" "جس میں "آئی چند رانی" "پانی کی میل

sundaymagazine.com.pk

میں سرکیز کرو ہیں رانی پر بیٹھ گیا کچھ کھوں کے لیے ہر طرف مدھیر سا چھان گیا۔ پھر چانک مجھے یوں لگا جیسے قریب پڑے میرے بل فوں سے ابھی تک کبیر خاں کی "دور رہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا، دوسری طرف وہی تھا "کیا ہو صاب" اس طرف بہت شور تھا، ابھی ہو "میں نے چلا کر کبیر سے پوچھا "کیا تم سے سے مارو یا کبیر ؟" "نہیں صاب" اور سنل پر وہ بالکل نشاے پر تھا، مگر چونک پر کوئی حادثہ ہو گیا، اس بے رنج جمع ہو گیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے "ایک مسلمان سڑک پر "میری "دور بیٹھ گئی "نہیں کبیر خاں، نہیں تم وہی آ جاؤ" کبیر نے احتیاج کیا "مگر صاب" "میں نے طے سے چچ کر کہا "یہ میرا حکم ہے، فوراً وہی آؤ" "ٹھیک ہے صاب"۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح کبیر کے گھر سے سانس لے رہا تھا، جیسے سیلوں ڈور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں غصہ نہیں کیا اور میں گھر و ہی ٹوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری ہری پار تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس۔ میرا ہی چادر ہا تھا کہ میں کچھ یوں میں ٹھہری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے کھن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت جلا کر رکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائیداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا سا سطرے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا داس آج بھی اسی ہری راوی کی طرح جی دست اور حالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی سے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی دیراں حالی بستیاں مقدر اس سے بے کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے میں کی یہی سونی سونی ہی لکھی تھی، لیکن اب میں پے اس دشمن دل کی حرید کسی چال میں نے والا نہیں تھا۔ بہت مس مانیں کر چکا تھا یہ اپنی بڑی دست اور حریفی خالی تھی آج تک میں نے اس دس کے کہنے میں آکر، مگر اب اس وحشی دل کو سر اور بیٹھ کا وقت آچکا تھا اور مجھ جیسے دس جیسے جب خود کو سر اور بیٹھ پر آتے ہیں تو دوسر بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف، نارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار و ریلے کو ایک فرمٹ کے درہم ہر کر کے سب کے حصے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی فرمٹ کے زیر انتظام ڈاکٹر پاں کے پلاننگ سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پاں کو ایک آخری ای میل لکھی۔ "محترم ڈاکٹر پاں میں سے اپنی پلاننگ سرجری کا کاروبار ملوثی کر رہا ہے، کیوں کہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست نکلی کہ چہرے بدے جاسکتے ہیں، تقدیریں نہیں۔ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہو کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرہ بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس میں کسی ایسے اور سے کو نہیں جاسا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل دے۔ میرے اور رے کی آمدنی سے ایک بڑا حصہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے، میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاننگ سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادریصوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا شاف آپ کے اور رے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کر دے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیوں کہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دوں گا، اس نے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی نگہوں میں میرے لیے حقارت یا ہمہ دلی کی وہ لہر پیدا ہو، جو ازل سے میرا مقدر ہے، اور اگر کبھی ایسا ہو تو وہ مح میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا میں نے ساری دنیا کی نظریں منسل میں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا، یہ بہت خیال رکھیے گا۔" سدا گونہی زاو۔

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کئی سمیت چند دیگر سینئر دفاتر دار محلے کے ارکان کو پور ڈف ڈائریکٹر میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتہ داروں اور محلے سمیت ابھی کے لیے ماہانہ مشاہیر کے علاوہ حصے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایب نظام کر، یا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارے سلسلے کی طرح چلتا رہے۔ جب مکان کو میں نے راست گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا، تو وہ ایک دم گھبر سا گیا "مگر مر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سر، یہ پاور آف انارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے" میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اسٹاف سے یہ سب کچھ کیلے نہیں سننے کا سر "میں نے اسے تسلی دی "فکرت کر دو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جا رہا اس چانک کچھ ضروری مسائل پیش آ گئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا، دیر دور ہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تیار ہے پاس مانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے"۔ کئی کی ٹیلیفون بھیک نہیں "میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم بھادوں گا سر، مگر یہ تو بتادیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟" "نی" "خاں تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کئی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں" اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خاں کا خاص خیال رکھنا، ایسے دفاتر بہت نایاب ہوتے ہیں "کئی افسر وہ سادہ دل میں بہت ہی باتیں بے لوث کیا۔ کچھ دیر میں کبیر خاں گیا۔ وہ کچھ چپ چاپ تھا۔ میں نے فہم کر سے دیکھا۔ "مجھ سے ابھی تک ناراض ہو کبیر خاں؟" کبیر نے جلدی سے کالوں کو ہاتھ لگا لیا۔ "نہیں صاب۔۔۔ ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا"۔ میں نے ایک گہری سانس لی "تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خاں، مگر محبت شاید ہمیں بدوں بنادیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مار دیا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ" میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خاں۔ "کبیر سر جھکائے وہاں چلا گیا

اگلے دو دن بھی نہ لگا کر ڈگئے اور پھر عدالت اور جینی کی امریکہ روگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دنوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ جینی کی اب بھی وہی صدیقی "میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار دنے میں سارے ٹیسٹ ہو جائیں گے، اور پھر آپ آپشن کے بعد ہم سب اکٹھے وہاں



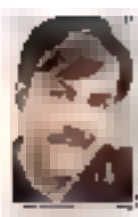




پھولوں کی پتیوں چابی ٹھکری تھیں۔ جاے لوگ سٹی میں چلے پانے والوں کے لیے سے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ س کی رسد ہی میں سے گلہ بول سے کیوں نہیں نہا رہتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے فلک لگا کر بندھ گیا اور نکھیں سود میں۔

ایک عجیب سی خاموشی چاروں پہنچی ہوئی تھی۔ انسان کی غم بھری لمبائی اور چپ کاڑ کا صدمہ سب کی خاموشی ہے۔ چاکل میرے بہت قریب ایک کرخت سی اور بھری۔ ”کون ہے بھئی ٹو“ اور یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے گھر کر نکھیں کھول دیں۔ ایک صحت گیر سا ہڈیوں کے ڈھانچے نما یڑھا کر پر ہاتھ رکھے تا ہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ”میں وہ دراصل“ اس نے کڑے تیروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کوئی قبر کھدوا لی ہے کیا؟“ نہیں نہیں میں تو بس“ اس نے مجھے دوبارہ سر سے چرنک غور سے دیکھا۔ ”اچھا“ میں سمجھا، ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے بڑی قبروں سے بڑیاں پڑا سنے یا ہے ٹو“ پر کان کھوں کر سن ہے، فقیر اتنا مہر ہے میرے باپ و دامی سی قبرستان کے گور کس تھے خبر و رجو یہاں سے ایک ہڈی بھی اوھر اڑھری“ ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سود کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بچ دوں گا“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوز سے کو کیسے سمجھ دوں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ کہیں۔ میں ٹھکڑ ہو“ نہیں، میں یہاں غروں کی ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کر نکالے کے لیے رک گیا۔“ فقیر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا ”کہیں ٹو، اس چھوٹے قبرستان کے گور کس صدمے کا سا تھی تو نہیں ہے، سچ بتا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟“ مجھے بھی صدمہ آ گیا اور میں نے سخت بچے میں فقیر کے کوچہ ڈر دیا، ”تمہیں، ایک ہار کی کئی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلائے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا تمہارا قبروں کی اس جاگیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا شاید یہاں کچھ ٹکڑے مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے بڑ پارہی، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں۔“ میں نے جاے کے لیے قدم بڑھائے، پیچھے سے فقیر نے کی ڈھکی سی آواز سنائی دی ”ورنہ تو کسی۔“ میں نے پٹ کر سے دیکھا ”معاف کر دے، دراصل پیچھے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظر میں آئے بیٹھے ہیں۔ ایک حال کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرت ہے۔ نام کیا ہے تم، اس ملائے کا تو نہیں لگتا۔“ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نہ نہیں سوجھا تو میں نے پنے پر اسنے ڈرا تیر کا نام بتا دیا ”کبر نام ہے میرا“ میں یہاں کا نہیں ہوں، بلکہ میں کہیں کا نہیں ہوں۔“ گھر بار ہے۔ کوئی رشتہ دار۔ بس، یونہی ہستی ہستی بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی“ کیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں“ فقیر اب بالکل نیا نرم پڑ گیا، ”وہ نہیں سمجھیں، بس ایسے ہی صدمے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ سیر جب تک جی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟“ میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں امت دیا ”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ فقیر رور سے ہنس پڑا ”اوائے بھٹے! پیسے کس نے، بٹکے ہیں تجھ سے واصل“ چا، میری کوٹھری میں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک غرو دو دن کا تھا، اس کے گھرواے میں سے چادلوں کی دیگ ہاتھ گئے تھے۔ بھی بہت سے چادوں پڑے ہیں۔“ میں چپ چاپ فقیر کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کنیا میں ایک جھلکا سی چادر پائی، کوئے میں پڑی پائی کی صرخی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیو کے پیچھے بنے دار چنی خانہ کوئے میں چند پرے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب سیتی، بچے کدال، اسی در قبر کھودے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیر نے ایک پلیٹ میں چادوں ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور مجھے پنے بارے میں بتاتا ہوا کہ وہ یہاں نہ رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، وہ میری طرح کس کا بھی کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیر کے کنیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیر سے دھست چائی تو اس نے مجھ سے پوچھا ”اب کہاں جانے گا؟“ ”پتا نہیں، جہاں یہ رستہ سے جائے۔“ فقیر نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک دیا ”ٹو! نہیں کیوں نہیں رہ جاتا، تیرا مکان بھی جو جائے گا اور میرا ہاتھ بنا دے والا بھی مجھے مل جائے گا“ میں نے حیرت سے سے دیکھا ”مگر میں یہاں کیا کروں گا۔“ ”دور در سے ہوا۔“ میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا؟“

(جاری ہے)



پ. ق. ۱۰۰۰ قریب

[illegible]

یہ نچوڑے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر بھی بہت دل گداز سی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پرست اور پرست دنیا کے ن گشت بد صورت رفقوں، بدویت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاویں سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پناہی پرانا ہے:

۲۰۰۰ء میں "روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، شمارہ نمبر ۱، آئی آئی چور میگزین، کراچی۔ اے ای میل:

ՀԱՌԺԱՆԿՄԱՅԵՆՆԱԹԵՐ՝ ՕՐԱԶԳՐԱԲԱՐ ՀԱՄԱՐԻՆ

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا“ میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی۔“ فقیر رو رہے تھا۔ ”جھٹ بولتا ہے خواہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ لکڑی کر۔ میں تجھے سب سکھا دوں گا، محنت سے جی تو نہیں چرانے کا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا ”اب میرے پاس پڑانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں۔“ فقیرے نے نئی آنٹی کر دی۔ ”ٹھیک ہے پھر آ جا اور ہاں، ٹوے یہ کپڑے کیسے پس رکھے ہیں، قلنا ہے کسی گورے عکریز کی قبر سے بچ کر لایا ہے یا پھر ہڈے باز کا مال ہے، گور کی ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا۔ میں تجھے پناہ ایک جوڑے دوں گا، کپڑے ہوں کر آرام کر لے، صبح بڑا کام کرتا ہے۔“ ہم دونوں اندر جھوپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کونے میں پڑے ایک ٹریک سے ایک بستر لگوا دیا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ”یہیں ایک طرف اپنا بستر ڈالے اور میں رات کو در اوپر سے سوتا ہوں، تیری کچھ نگہ تو مجھے سوجاتا“ فقیرے نے ہی جیب سے ایک مگھوس برغ کی بیڑی ٹھوڑی اور اپنی چار پائی کے تلے کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی اور کاغذ میں لپی بہت سی بھورے رنگ کی راؤم تیلیوں میں سے ایک بن کر اُسے اپنی بھتیجی پر رکھ کر گڑے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تبا کو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلائی۔ جھوپڑی میں ایک عجیب سی ناگور بو پھیلی گئی۔ فقیرے نے رو رو کر تیسرا کش لگایا اور دھواں لٹا میں پھیلا کر بولا۔ ”کبھی جس لپا ہے کبرے؟“ میں نے لٹی میں سر ہلایا۔ وہ در سے ہوا۔ ”چھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔“ پر میرے اس کے بنا کر نہیں، قبرستان کی رائیں بڑی کالی اور بھی ہوتی ہیں، کچھ بتاؤں تو لو جو جی میں مجھے یہاں اکیلے رہنے بڑا ڈر لگتا تھا، بس ٹی دلوں میں یہ ست لگ گئی۔“ فقیر ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سناتا رہا۔ شاید اسے بہت دلوں کے بعد کوئی نیند والا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بول رہا، میرا دھیان ہمارا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر غصے کا آسب اور عورت مجھے سائل لگنے کے لیے اندر سے بلو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہوئے کو آیا تھا۔ اب تک تو اسوں نے تھک ہار کر میری کھونچ ختم کر لی ہو گی۔ وہاں عزیار کب میں  
میں کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہوں گے در شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہوئے وال ہو گا۔ دو بجھے عین وقت پر وہاں پہا کر کتنی مایوس  
ہوئی ہو گی، مگر یہ مایوسی یقیناً اس مایوسی سے کہیں کم ہو گی، جو آنکھیں ملنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدناں نے سرور سے سمجھا  
نہا کر آپریشن پہر مئی کر لیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد میں دنیا کے رنگوں کو اپنی خوب صورت آنکھوں سے  
دیکھے گی۔ ہماری رات ماہر قبرستان کے دیر نے سے گیدڑوں، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی رہیں اور فقیر اسے سندھ پڑاڑاٹے پیتا  
ہا۔ وہاں میرے اس پاس سب مئی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیر اپنی چارپائی پر، اس ایک میں مئی تھا جسے میں غنیمت  
آرہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیر اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کنیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے اس پاس پھر کر اپنی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور  
پھر کسی یوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظر میں بٹھا کر بیٹھ گیا۔ کھٹے بھر بعد مئی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں  
دخل ہوئے اور فقیر نے کوئی قبر کا پتہ نہ پکڑ سکے۔ فقیر نے ان کے جاتے ہی خوشی سے سر دکھایا۔ ”وہ بھئی کبیرے کو تو میرے لیے  
بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، رہتا ہے درون سے فارغ مینا تھا میں۔ کون مر کر مئی نہیں دے رہا تھا ہماری سستی میں۔ چل آ جا شادش، ہمیں  
کھٹے بھر میں قبر تیار کر لی ہو گی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد ”میں گے“۔ میں کسی معصوم کی طرح کام میں جت گیا۔ فقیر اپنے کام  
کا باہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مقبرہ کی جانب لٹ تیار کر لی ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مئی اٹھواتا اور قبر کی تیاری کے  
آزمودہ نسخے بھی بناتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پیٹنے سے شرور ہو چکا تھا۔ میں نے حق کے بتائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری  
کی تھی، مگر درمیانی عمر سے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ مئی تھی، لیکن میں فقیر کے ساتھ جا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دیتا  
چاہتا تھا کہ جسم کی ٹوٹی رگوں سے میرے مائی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ  
آگیا، مرحوم کے دربارے روتے دھوتے، سرد اور سوگو رماحوں میں لاش کو قبر میں اتار اور سب نے مئی ڈالنے کا فریضہ سرجام دیا۔  
فقیر اس تمام عمر سے میں ایک جانب، تعلق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا، مگر یہ رات ولی ”حاصل“ بیزبی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب  
جا کر بیٹھ گیا۔ فقیر نے مجھے کسی ماری۔ ”بھی دیکھا کچھ ہی دیر میں ان دنوں دھوئے والاں میں سے سگریٹ پیٹنے والے دھیرے  
دھیرے ایک جانب سر کٹنا شروع ہو جائیں گے در یک رو کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیزی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی  
باتیں شروع کر دیں گے۔“ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیر کے طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ ”برسوں سے  
دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما۔ سگریٹ اسی بلا ہے، جو موت بھی بھلا دیتی ہے اور تجھے اب کچھ بتاؤں کبیرے، میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نیٹے  
میں دھت لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں جیسے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آ جاتا ہے، بھگے داڑھے  
قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمیں پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح۔“ میں نے فقیر کے ہاتھ میں پکڑی بیزی  
غور سے دیکھی۔ ”تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اٹھراٹھ لیتے رہتے ہو، میں نے سنا ہے اس سے کبیر ہو جاتا ہے۔“ فقیر نے بڑی مشکل  
سے اپنی مئی پر قابو پایا۔ ”تو بھی اس حالوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں،  
میں نے پہلا کش لگایا تھا، یقین کر آج تک کبھی کام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس  
ہتیس سال کے جوان فردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تمہا کو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا درن کے ساتھ آتے دے اس بات پر  
حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ چٹاتا تھا، نہ شراب، بھر چا تک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کبیر  
سے مر جانا چاہیے تھا۔“ میں لاجواب ہو گیا۔ ”تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیزی کے پٹے پر موت کا ڈر ادا کیوں لکھ دیتے ہیں؟“ فقیر نے دبا  
دبا قبہ لگایا کہ اس کی آواز قبر پر مئی ڈالتے دربار تک نہ پہنچے۔ ”مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے ایہ کیا  
بات ہوئی بھلا، ہر ہے، تو پھر پیچے کیوں ہیں کھٹے بار میں، بند کر دیں اس کی فردخت۔“ مرحوم کے دربار دعا سے فارغ ہو کر دھیرے  
دھیرے پٹ رہے تھے۔ قبر پر قطرہ کیڈے اور گلاب کی ٹاپوں کا چمڑ کا ڈ کر دیا گیا تھا۔ فقیر نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔  
”اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رو دتی رہے گی، درور نہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی  
مئی دکان داری میں الجھ کر مائی شخص کو بھول جائیں گے، بھٹسا ایسا ہی ہوتا ہے کبیرے۔“

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیر روبرو سے لونا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور بارود بیڑی کے کچھ بندے تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ”یہ تیری مزدوری کا حصہ ہے، آدھے پیسوں کا تیس سا مان لے آیا ہوں۔“ میں نے وہ روپے دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ”یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ فقیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر روبرو سے ہنس پڑا۔ ”تو بھی پورا اٹلک ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہے دے۔“ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی جگہ منتر پڑھنے کی آدریں تھے۔ میں گھبرا کر ٹھہر بیٹھا۔ فقیر اچھٹ پڑی کے باہر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا۔ ”یہ آدریں کیسی ہیں؟“ فقیر نے سب حسب عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ”کوئی عامل کسی راتلی کو بے وقوف بنائے کے لیے منتر پڑھ رہا ہے۔“ میں نے دور اندیشی سے اس کی بات کوئی جملی جملی حیرت سے منکر ہو کر کہا۔ ”یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے، وہ اپنی سو کن کوہی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے لہذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم ماری ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے ٹھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں جھی جھکی، رقم اس کو بھونگی کو پکڑ کر وہاں چل دیں گی۔“ میں نے حیرت سے فقیر سے کو دیکھا۔ ”مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈر سے باری کیوں ہونے دے رہے ہو؟“ وہ نے کبر سے انکو واقعی برا بھولا ہے، جھٹلے ”یہ عامل مجھ سے پیسہ ہی سود کر چکا ہے، کوئی پیسے میری جیب میں آئیں گے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں مد سے ڈراؤنی آدریں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیسے صاحب کی ”کرامت“ کا ثبوت کر لیں، یاد رکھو کہ کبر سے، قبرستان میں جو بھی دھندلایا ہوتا ہے، اس کا آدھا حصہ قبرستان کے رکھوے اور گورکن کو جاتا ہے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے فقیر سے کی باتیں سن رہا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اساتوں کی دنیا کے بھروسوں اور سکر و فریب کے چاں کو دور رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مردوں کی ہتھی کے کھنڈے ڈھکوسلے بھی ترا لے ہیں۔ کئی رات فقیر سے مجھے یہ بھی بتایا کہ پردن اور خالی قبریں باقاعدہ منے بار اور جو ریس کو کرانے پر آئی جاتی ہیں، تاکہ وہ رات بھر پناش مل سکیں، عینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصد ملنے کے بعد یہاں کا رخ نہیں کرتا جلی عامل اور جہ پڑنے کے گورکن پر اثر درمیں ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات ہی میں، میں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیر کے قبرستان پہنچ رہے ہیں کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے حلاف دیا گیا تعویذ یا سفل عمل وہیں ملے گا۔ صرورت مند ہے چارواں گا بھ کا قبرستان آتا ہے، جہاں فقیر اپنے ہی سے کسی کان مرغی کا سر، مڑے ہوئے نڈے یا کسی بکرے کی سری دیا چکا ہوتا ہے۔ سافل، اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی غر بھر کی پونجی عامل پر لکھ دیتا ہے اور فقیر کے حصد اسے مل جاتا ہے۔ میں دن بھر میرا حیرت سے فقیر سے کی باتیں سن رہا ہوں۔ ”ہر جا جہاں دیگر“ کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میر دن تو سب روزمرہ کی مصروفیت میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تنہا کرنے کے لیے فقیر کے حصدے کا کام بھی خود کر لے لگا تھا، مگر رات کاٹنے میں کتنی تھی۔ چاکلی سی کسی پیر دو میرن آنکھوں کے درپے کھول کر میرے دس کے آنکس میں ”کر بیٹھ جانی، میں لا کھ خود کو ٹھپاتا، اپنی آنکھیں میچ دیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کام کرتی تھی۔ مجھے اپنے شب دور بتاتی، میری کرخت لگیاں، کداں اور بیچہ چلانے سے کھر درے چھاوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور جھوپڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گشتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیر بھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔ ”کیا بات ہے اکبرے انوسونا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جوں جہاں بندہ ہے تو، نہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو کیا تھے؟“ میں شکر اویا۔ ”کیوں کیا دوسارے جوڑ توں کو جاتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟“ فقیر بھی مس پڑا۔ ”ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، تو شادی کیوں نہیں کر دیتا، کب تک یوں، کیلا در بدر حوالہ ہوتا رہے گا؟“ اور اگر یہی سوس میں تم سے پوچھوں کہ تم سے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر؟“ فقیر نے ایک لمبی سی سرد ”بھری۔“ دیکھ کر ”یہ رانیاں بڑی مٹلی ہوتی ہیں ان سے بندہ ذور ہی رہے تو چھ ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، چھ صاحب مردان کے چکر میں نہ دیں کار ہوتا ہے، اندہ دنیا کا۔“ میں نے غور سے افسر وہ فقیر سے کو دیکھا۔ ”پھر تو میرا شک سولہ آنے چ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیر نے درند یوں غم زدہ نہ دینے ہوتے۔“ فقیر نے تارود بیڑی سلگائی۔ ”کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک۔“ یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں وہ ہو گئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچ کیا، ہر مشکل وقت میں سہار دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بھڑکنے ملا، دوبول کلاچ کے چڑھا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ بس، اسی دنیا سے میرا دل عورتوں سے ہٹا رکھا گیا، میری ہمت کان کھوں کر سن لے اکبرے یہ رانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکر میں نہ پڑنا۔ اب میں اسے کیا جاتا کہ یہ ورت مجھ پر جائے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ کئی رات دور کسی قبر کے سرہانے روئے کی آدریں آئے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا، مگر ”دراں میں اتنا در وقت کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کنیا سے باہر نکلنے لگا تو فقیر نے مجھے آدرے کر دیا۔“ باہر۔ جا اکبرے کوئی دیکھاری ہے قبر پر چڑھ کاٹنے آئی ہے اولاد کے لیے۔“ میں نے حیرت سے فقیر سے کو دیکھا۔ ”مگر قبر پر چڑھ کاٹنے سے بے اولاد کی کیسے دور ہو سکتی ہے؟“ فقیر نے صبر کر کہا۔ ”تو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کمزور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے بولے دے۔ ہم ان کو یہاں آسے رو کیوں گے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔“ ٹوچ کر کے سوچا۔ میں نے زمین پر سر لگایا، مگر میرا دھیاں اب بھی باہر تھا۔ ”فقیر سے“ کیا تم نے کبھی کوئی بھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟“ ”ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں۔ پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تار و کلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تو رات کے اندیر سے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آدریں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھا اکبرے قبر میں جاے کے بعد بندے کا رابطہ ڈریکٹ س کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر میرے تیر سے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل نہ دے گی نہیں کر لی چاہیے سوچا چپ کر کے کل صبح فجر کے بعد ہی، ایک قبر کھودنی ہے، عکزی رقم ملے گی اس شاء اللہ۔“

اگلے روز فقیر انہیں سے خبر اٹھا لایا۔ ”چل بھی اکبرے منڈا او کیسے چلتے ہیں۔“ میں نے چوتھ کر سے دیکھا۔ ”منڈا۔“ ”ہاں بارادہ کیا کہتے ہیں سنیہ، یہ دیکھ بری روبرو دست چکر لگی ہے بارود لے سیمائیں۔“ میں نے اجار پر نظر اوڑنی تو میرے ہاتھ کھپکھپ سے گئے سنی کی فلم ریمیز ہو چکی تھی درنہ بہت ہو کر سوار جوئی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے سنی عرف شہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جاتا تھا۔ شہ پارہ کا اندرونی بھی چھپا تھا، جس میں اس نے کھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری روتہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ میں نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پارہ کا خوب پوچھا گیا ہے اور میں نے پری روتہ کو پتا خوب کر۔ پتا سب سے برا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیر سے کو کیسے فلم دیکھنے کے لیے بھیجا، یہ فلمیں دو لوگ دیکھتے ہیں، جو جواب دیکھنا جاتے ہوں، وہ اپنے کسی خوب کو سنیہ کے پردے پر جیتا جگنا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خوب ہی نہیں ہوتا تھا، سب سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خوب دیکھ سکے فقیر سے کے جانے کے بعد میں نے سارے اخبار کو بارود خور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے رات نہ ہو چکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر گلتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی برس اور کاروبار کی خبریں، وہی ہنگامے نساہ کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دیباچہ کر پیسے کے دعوے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتھا۔ ہم انسان کتنے بھوسے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لے



بیٹھے ہوتے ہیں کہ انارے جاتے ہی سب کچھ ڈک جائے گا یا بدن جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا انار ابونا۔ جو مناسب رہ رہے، تو پھر اس نہ سوئے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، تا مھنڈ کس لیے؟ مجھے پھر اس دھمک جان کا خیال ستائے لگا۔ اب تک تو اس کی چٹائی وہاں آچکی ہو گی، جاے وہ وہاں آے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکن تصویر جلا کر وہاں سے لکھتا، تاکہ جب کبھی مٹی وہاں آئے تو اسے میری کوئی بھی صورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھینچنے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو سرور میرے گھر پر دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں سے مجھے وہاں کھڑا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دیکھتی ہوں گی، اس کی وہ کھو جاتی ہوئی آنکھیں، اس بار میں نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر پہنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے برابر استغیاں چبڑاؤں کو چھو بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روئی رہی ہو گی، مگر عدنان سے سنبھال یا ہو گا۔ اس کی کولم جیسے کوندناں کا شانہ ہی بچتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں۔۔۔ مری جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرے کی فرصت بھی کہاں میسر تھی۔ ان، منتوں اور بختے میٹوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیر صبح سویرے کسی کام سے بار ر گیا تو شام تک وہاں نہ لوٹا۔ میں جھوپڑی کے ہر بیٹھا اس کا نظار کر رہا تھا کہ اچانک پوئیس کی پرانی ویز جیب قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔ حاکم کی جیب سے دو سپاہی بیچے قرے در اس میں سے ایک نے حسب عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ "کبر تیر ہی نام ہے؟" میں کھڑا ہو گیا۔ "ہاں، سب خیر تو ہے؟" "خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیر سے پر ساتھ داسے چھوٹے قبرستان کے گور کن سردے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل رہی ہے، دو تھم سے مانا چاہتا ہے۔" میں بوکھلایا سا اس کے ساتھ جیب میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پوئیس والوں کی آہ میں مات چیت سے مجھے بتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پرانی دشمنی چل رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور "فقیر" کے سردے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیر "آخری سانس" میں رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "دیکھو اس کبرے قبرستان کے دھندے سے قبر تک پہنچاؤ، پر خوشی غلطی نہ کرنا بندہ جتنی بھی حد بندیوں کرے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے۔" فقیر ادھر سے دھیرے دھیرے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دہائیوں میں نہیں آیا۔ سلا، اور اس کے ساتھی قتل عام کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے درپے مجھے نہیں سونے تک پہنچانے کا پورا ہندو بست کر لیا۔ فقیر سے کسی کی جاگیر، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی چاہت ہو گیا اور فقیر کے چایسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پٹلی گاڑی پکڑی، پھر سے وہی سفر اور وہی تھکانا دیتے۔۔۔ مگر میری حالت درجہ درجہ بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ جائے کا ٹھکانا پھر مسلسل برسات کا مگر میرا بدن چمکے لگا۔ در پھر شدید تیز بخار سے مجھے آگیا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اتارنا پڑا۔ فقیر مجھے ملنگ کہہ کر پیچھے رہا تھا، مگر اب میرا حلیہ در میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہذا میں نے اپنی پرانی چادر کی ٹیگ مار کر خود کو چھٹی طرح پیٹ لیا۔ ڈاڑھ چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر یہ نما سی لکھائی میں لکھا تھا "حالت کی چائے، ہر لمحہ بھگانے" ٹھیلے والے نے مجھے ٹھنڈے دیکھ کر تو ایک کپ چائے سے کر میرے قریب "کیا چائے پیو گے؟" میں نے انکار کیا۔ "نہیں مجھے طلب نہیں ہے۔" ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "عجب بھکاری ہو، بھئی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیسے نہیں مانگ رہا ہوں" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "بھکاری" "ہاں ٹھیک کہنا تم نے میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھینک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، اب کچھ نہیں مانگا۔ سب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔" حوالہ چائے میری ڈسٹ کو کیا بھکا کہ اس کا لہجہ ایک ام عاجز نہ ہو گیا۔ "معاف کرنا سائیں تم تو کوئی اللہ لو کہ ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی" میں نے اسے جھڑپا دیا۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، کیلا چھوڑ دو مجھے" حوالے جاتے جاتے بھی تین بار سڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگای، جس کے تنے کے روگردہائی اینٹوں اور سیٹ کا چوبارہ اٹھا کر ایک گول پیٹ فارم سا بنادیا گیا تھا۔ پھر مجھے بتایا کہ میں کب کھلے شہد ہو کر ہوش و حواس سے بھاگ رہا ہوں اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چندھ دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑا کٹھی تھی اور وہ سب "اس میں نہ چائے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں "نادیکہ" کے حوالے سب کو ڈنٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ "چلو" "کیا بھیڑ لگا رہی ہے" جو گی بھاگ کر ہوش آ گیا ہے رشید لیے مراعات میں چلے گئے تھے" میں نے چونک کر اس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)



قدموں میں رکھیں اور غلاموں نے اور اگر کنگی بھیل کو جھڑک کر پرستے بھاگایا۔ لڑکی لوگوں کی بھی اور اس کو سب "چھوٹی سرکار" کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب "کرچھ گئی" میں سر جھکانے بیٹھا رہا اس کی چوڑیاں ٹھکنیں "میر نام گل ناز ہے جو گی سائیں رب کا دیاسب کچھ ہے، پر گودا بھی سوتی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے"۔ اس کی نرم و ملائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اسم یا مسکی تھی، پتے نام کی طرح، جس پر پھوس بھی رنگ کریں، وہ گل ناز تھی۔ نمبری و کتار تک، آنکھوں میں کاجل، ناک میں سوسے کاونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال پیٹے وہ خود گلاب کا پھوس لگ رہی تھی۔ ہل بھری میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے تابید، پھر لٹنی، جلی، صبا اور مینی کا چہرہ جھلکنا نظر آیا۔ میں نے گھبر کر جلدی سے "کھیں بند کریں" نہیں، اب اور نہیں۔ اس عورت، جلی جیہاں سے اجا پھر بھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے "گل ناز" کر بیچے جلی، تو خانہ دور سے بھاگتا "آیا۔" جو گی سائیں جلد میں آگیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی فراد پوری ہوئی۔" لڑکی بھی تک گھبراہٹ ہوئی تھی۔ "چھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے۔" خانو نے بڑے ڈھم سے جواب دیا۔ "بکی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظر تھا کر بھی نہیں دیکھا مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا اس کی پاپا ہوئی۔" گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اٹھ کر خرابیاں خرابیاں وہیں چلی گئی۔ گلے چند دلوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جو گی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوب صورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔

اب میں بھی کیسے سمجھتا کہ شس کا بکی رہا تو ہے، جو اس سے میری رگ، رگ میں سریت کر کے میری زوہ کو قلم عمر ٹھسنا مارا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار دیکھ چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک لوجوان جو ڈانٹا کھٹکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ "لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سہجے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے سے بد سٹھی کھوں وہ پچاس روپے کا مو ترساوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔" ہمارے لیے دعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر واسے ایک دوسرے کے، ضمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے" میں نے ہوس کے س جوڑے کی طرف دیکھا۔ "صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ تناسبتا ہے تمہارا رشتہ؟" "لا کا کچھ شرمندہ ہو گیا۔" میرے پاس تولی خالی اس سے ہی ہیں۔" میں نے نوٹ پر سے کر دیا۔ "اسے پیسوں میں جو گی سائیں شادی نہیں کر داتا۔" لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے پتے کاوس میں پہنی موے کی بایاں تار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ "لگتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بایاں وہیں غلاو لڑکی، محبت مگر بچی ہو تو بڑا استحواد یا کی سب سے بڑی دعا میں جاتی ہے۔ وہاں چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس امید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دعا ہے، تمہاری منت اور تمہارا تعویذ ہے۔" وہ دونوں یوں خوش باش لگے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔

اب یہ محبت کرے والوں کی "زود جمیاں۔۔۔" محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پاس کی ڈھس میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جاں پاتے کہ دیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا مقرر ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبت سے غرض ہونی پڑی ہے کہ وصل یا وصال ہے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے چو بیٹھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام طرہی مسند پر ایک لمحہ بیٹھے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سار جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ ہل بھلے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے اور پھر میری طرح بکی ایک خواہشوں میں بے بیش کے لیے حاکم میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے حاکم ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے میری حالت اب زیادہ تر اتیر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن تاریخ، میسے اور اس سے ب کوئی سرد کار نہیں تھا، مگر دور کھڑے خانو کے طیسے پر بدلتے رہنے کے لائنس سے تنہا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ رانک عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم کے کروٹ بدلتے اور جائزے کی سردی اور کبر سے صاحب پر پتا سمید غلاف پیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلیے غاف کتے بارش میں بھینکتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھا لے آیا تو میرا ہاتھ ٹھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چنچل نکلی گئی۔ "ااااا" ضمیں تو تیز تپ ہے سائیں۔ میں بھی حکیم صاحب کو لے کر آتا ہوں۔" خانو نے قدموں وہیں بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر "سے روکنے کی کوشش کی کہ بے یہ روگ حکیم، طبیب یا دیدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فائدے کا نظارہ سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تھوڑا بہاد کرنے کے لیے کیا کیا حق نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دوغلی دہا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑنا چاہے، یہ اسی کے دامن سے پھٹی رہتی ہے۔ خانو گھڑ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جزی بوٹوں سے نئی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چڑے کے بکس میں سے چند صوف نکالے اور بیک جا کر کے تین چار سیٹیاں بنی بنا دیں۔ "یہ لو خانو میاں" صبح دوپہر شام۔ دن میں تین تین مرتبہ سادے پانی میں گھوس کر پلائی ہے یہ دوا۔ سرائی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" خانو نے کسی تجربہ کار دور مستند چاردار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایت زبر کریں۔ شاید صاحب نے خانو جیسے ہم دوروں کے لیے ہی کہا تھا کہ "پڑیئے گریباں" کوئی۔ ہو چاردار" مگر میرا تھوڑا دور کسی صورت میرا بچھا چھوڑے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعا میں بانٹا پھر تابوں، خود اپنے لیے شفا یابی کی دعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم سے جاتے جاتے میرا شانہ تھپتھپایا اور مسکرا کر بولے "فکر نہ کریں سائیں جی، جلد ہی مجھے چٹکے ہو جائیں گے۔" میری ریاں بے ساختہ پھسل پڑی۔ "کچھ مزید تیار کرے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟ حکیم نے پتہ تک کہ میری طرف دیکھا۔ "نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ مو، مٹی کی کوشش جاری رکھنا ہوں۔ مگر لگتا ہے یہ ہر آپ سے خوب بیکار کھا ہے، پر تقدیر سے لڑے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی۔ جو جتنی سائیں لکھو کر دیا ہے، سے اتنی جتنی ہیں خود کو سر دینا مناسب نہیں" خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہوئے والایہ مکار سے رہا تھا۔ حکیم صاحب جاے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ "دیا کی ہر طب کا تعلق کسی۔ کسی طور سناں کے عصاب اور اس کی شفا یابی کی خوشی سے سرور ہوتا ہے۔ جیسے کی خوشی اور صحت کی آرزو ہمارے عصو کے غیظوں کے دروازے، دوا کو بند کرنا شروع کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، اور نہ سب دوا میں ناکام و نامرد موٹ جاتی ہیں۔ اپنے جیسے کی کوئی وجہ پید کیجیے صاحب"۔ حکیم صاحب پھٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دار کے علم سے نہیں ہوتا۔ انساں کے اندر جہاں تک لیڈا ہی صلا، ایش و حکمت ہے اس چھوٹے سے قہرے کا یہ حکیم بھی کچھ یہی دانتا تھا، جو صرف اسان کی جلی دیکھ نہیں جانتا تھا اس جلی کی بولی بھی پڑا سکتا تھا۔

خانو شہد سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیار وری میں بخار دیا۔ تیسرے دن اصول، ہاتھوں کے ساتھ ایک بھوم در در بار کی دیکھیں، ہر چادریں، سہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیش کے پیٹ فارم پر "آپچا" غلاف کھلا کر میں دار صاحب کی حد سے من دے اور ان کی گل ناز لے انہیں خوش خبری سنا دی ہے کہ ان شانہ جلد ہی اس کے "گھن" میں پھول کھٹنے والا ہے۔ تو زری دیر میں جتنی منائے والے یک دم خاموش اور موافق سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ میں دار صاحب خود تشریف لارہے ہیں۔ میں در ہلکی غر کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ و فصیح رکھائی دینا تھا۔ گل ناز بھی اس کے ساتھ میرے قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے زور سے



سے اشارہ کر کے اپنے سر کے شارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ میں دھڑکے سے میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ "میں پیچھے  
 اس تھکنی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سا کچھ جی۔ بچہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں سے ہمیشہ کچھ سمجھا تا رہا، یہ ٹھیک ٹھیک  
 کر پڑوس فقیروں کے در پر منتقل ہو جاتی اور چڑھا دے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھا داتا تو ہمیں ہی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پہ  
 بٹھا کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ غریبیاں تو کھڑی کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا نیا وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا خدا  
 کے لیے نکال دے گا۔" میں نے سر جھکا کر، شرمانے کی جھنجھکی مائل کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن زور کھڑے یہ تمنا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ  
 رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا ہاسپتال اور سکول بھی عمارت ہوے دار ہے۔  
 میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر رہنے رہناں کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ جھگانے کا باعث ہو گا۔ میں کہیں  
 جاتا تھا کہ جہاں بھی کسی کے لیے تھی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ یہی  
 تھا، جتنا میں تنہا رہتا تھا، میرے گرد ہجوم کسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہوئی، تو میں نے اپنے بکھرے  
 وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیاں سے رات کے تین بجے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے رینگتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانہ  
 سمیت سارا پلیٹ فارم جہاں کی چند سورتھیں۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پہ بکھرے خشک ہوسے پر بیٹھ کر رہ گیا۔

اگلے دوپہر کسی نہ بوگی کا آہنی دروازہ سر کا پتھر کی آکھ ٹھٹھکی گئی۔ کون ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے درخت جھج  
 میں پوچھا۔ "تم کون ہو، اور یہاں حالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "فقیر ہوں، ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے،  
 اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم پناہ مانا دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں مانا۔" ریلوے اہل کار کا بوجھ تبدیل ہو گیا۔ "میرے یہ مطلب نہیں تھے  
 بادشاہ پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو بے بہت بھر اس کی بکٹش پر کھڑی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو گا ریلوے لائق تو بتاؤ۔" "نہیں،  
 تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اتر جاتا ہوں۔" میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن منساں پڑ تھا۔ شاید یہاں  
 گاڑیوں کا گزر آسمانی ہوتا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ اچھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک برا تجربہ۔ پہلے ہی ہو چکا تھا، مگر اس بار میں  
 نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ دھارے کے بجائے، قصبے سے دور جاتی ایک پگھلائی کی روٹی۔ سارا راستہ کنکر اور کانٹوں سے ناپڑا تھا اور زور زور  
 تک ہڑے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور ریتے بھر ڈھوں ڈٹی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی  
 کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جڑ سے پرے ڈیرہ دھارے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بوڑھے درخت کی  
 بے تمنا شاخ پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن بنا رکھا تھا۔ شام ہوئے سے پہلے میں نے اس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور  
 کانٹے ہٹا کر اپنے گھر کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس رات ہی مشقت ہی نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں  
 درخت سے ٹک لگا کر سوتا رہا تھا کہ زور سے ایک بوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچے کو بٹھائے قرماں خراں پھیل مارتا میرے قریب سے  
 گزرا اور پھر آگے جا کر رہ جائے سے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا میں نے بے رخی سے "نہیں بند کر لیں پھر وہی سوم  
 رات؟" بوڑھے نے میرے قریب "کرا بھی طرح میرا بڑھ گیا۔ میں بے چارے رہنے ہی میں عاقبت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا "اس  
 علاقے میں تیرے آنے لگتے ہوگی۔ میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمال۔ کوئی روٹی نگر چاہیے ہو تو بتاؤ گی۔ میں اس علاقے کا ذکیا  
 ہوں۔" میں نے اور کھڑی سائیکل کے پیچھے سے کھینچتے بچے پر نظر ڈالی۔ "نہیں میرے پاس جموے میں کچھ چنے اور گڑا موجود ہے۔  
 مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔ بوڑھے مہر دین پر میری کڑھکی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ اس پاس میلوں دور تک  
 چمکی بھر دے تب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا "صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ نماں اور جنازہ بندے درڈنگر سارے ہی  
 جوڑے سے پاں پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صوفی صاف پانی  
 لا دوں نہیں۔" بوڑھا ٹھہر کھڑا ہو۔ "چل کہے تیری ماں رو دیکھتی ہو گی۔" مہر دین ہنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دوپہل کے  
 لیے رکا۔ "جو گی اور سائیں لوگوں کی دعا میں بڑھتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دوپہل پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔"  
 میں حاشوش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی غھٹکی آدھیری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے شکون کی سانس لی اور آنکھیں موندیں مگر شکون  
 جھلا کب لکھا تھا، لکھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلے صبح جب میری آنکھ کھلی تو آسمان ہادوس سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا میہ برسا کہ ہر طرف جل ٹھل ہو گیا۔  
 چانک ایک جانب سے شور مٹا تھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین، ایک ہجوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑ چلا آ رہا تھا۔

بائیں دیکھو۔ جوں جوں مل نے پسہ بد، نلک کے معروف و معروف ڈراما اور انٹرنیٹ پر ان کے ناول "خدا اور محبت" اور "پچھلی کا  
 سہ ماہی میں ان فونی پر ان کی حاصل کی تو نلک، منڈے کے گھر میں شادی ہوئے وہاں "عبد اللہ" کی ایک وقت کے پسہ بد "پچھلی  
 " کا رونا حاصل ہوا۔ میں نے ان کی خدمات پر محنت پائی۔ یہ تمہیں جس کا "کی ہے وہ" ہے۔ فلم کے ٹکٹے میں  
 خدا نے ان کی ملک میں "اقدی ملک" تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھا ہے۔  
 پہلی بار "ایک چھوٹے صاحب اور قد کے مشعل موصوفہ" میں بہت سی گہرائی کے لیے فحش کی صفات تھیں  
 "میں نے ان سے عیب نہ سنا۔ یہاں پر "پسہ بد" کی بات کیا ہے۔ یہاں پر "پسہ بد" کی بات کیا ہے۔ یہاں پر "پسہ بد" کی بات کیا ہے۔  
 سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیں گے۔ ہمارا پتہ دہلی پر ہے۔

ایڈیٹر: عدنان عزیز رور، نلک، شعبہ میگزین، جہانگیر آباد، لاہور۔ ۷۷۰۰۔ پتہ: ۷۷۰۰۔ پتہ: ۷۷۰۰۔ پتہ: ۷۷۰۰۔  
 sundaymagazine@janggroup.com.pk

ظلیل جبران نے کہا تھا "جب کبھی میں نے مہر کی رہیں میں اپنے رور کا پورا بیچا بدے میں س نے مجھے خوشی کا پھل دیا" مگر شاید  
 میرے لہیب میں صرف درد "فلم دور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دیں اور اس شور مچاتے جھوم کی صورت میں ایک نئی  
 مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بوجھ ڈھیر تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیر تھا۔ پاؤں میں پارے چٹکیں اور  
 سرد پناہ کا آبی اور چھید بھری برے نام چھریاں "وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے پھرے ہوئے تیز دیکھ کر حاموش کھڑے  
 ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی ہوئی کی بوی مترنم کے فراکش سر اچھا مچتی رہی "مگر دنیا کا سب سے مشکل کام  
 شاید حاموش رہنا ہے۔ سو ان سب کو بھی یہ حاموشی گھسنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے سخت کی اور ہلکے سے کھٹک کر بولا "یہ  
 سب یہاں تمہارا شکر یہ ادا کرے آئے ہیں سائیں لوگو" میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس غم اور خشک علاقے کی قسمت بھی  
 گھٹنے والی ہے "مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا"۔ میں نے درشت لکھ میں سب کو دھتکارا۔ "یہ بڑھا مہر دین ایوان  
 ہو گیا ہے شاید"۔ در تم سب بھی دے دے ہو "جو اس کی باتوں میں" کہ یہاں چلے آئے ہو "بارشیں پہ وقت ہی پر برتی ہیں،  
 چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی "جاؤ جا کر پانی دھو کر کرنے کی کوئی تدبیر کرو" در پھر سالوں تک پانی کو ترستے  
 رہو گے۔ "پتا نہیں انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی" مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور کچھ عطر کے چھوٹے آگے بڑھے  
 کسی نے چادر "کسی نے چادر" ٹکڑا درجنوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خان کر دیئے کوئی جیب میں چند تھکے بھر کر لایا تھا، تو کسی  
 نے دودھ سے بھری گڈوی میرے سامنے دھری۔ مہر دین رو پڑا۔ "ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لوگو" سے قہقہے کرنا اور دودھ  
 کر دے اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہ کر ہمیں ڈیرہ ڈالے رہو گے" میں نے اپنا سر ہکا بکا کر دیا۔ ان لوگوں کو مزید  
 سمجھا دے فائدہ تھا "اس مجھے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے  
 ہر کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی "فتح" جیت سکتا ہے "مگر مقدمہ سے نہیں لڑ سکتا۔ سو مقدمہ کے ہاتھوں رخمی ہو کر میں وہیں درخت کے  
 نیچے بیٹھا بیٹھا رہا، پر کچھ بارشیں صرف غمزدہ مرنے کو میرا اب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں "جودل کے سگٹے" گلے کو بھگودے "اب  
 سادون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟" گنگے رور مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ "مگر اس کی ہستی دلوں سے مجھے  
 زیادہ تنگ کیا یا اس کے علاقوں میں اس ثقافتی بارش کا کوئی کچھ نہ تھا، تو میں چپ چاپ یہاں سے ٹھہ کر کسی دور جانب نکل جاؤں  
 گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کالوں کو ہاتھ لگایا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا "گناہ" کرے گا نہ کسی اور کو کرے دے گا

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی غنی بستی یا جنگل کی جانب لپٹنے سے پہلے کچھ دن یہاں بتانا ب نا گریہ لگنے لگا تھا۔ میں  
 نے سوچا یہ تھا کہ میں یہ جو گی سائیں کا لقب اوراں بھولے بھولے لوگوں کی یہ خفیہ الاعتقادی کابیت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے  
 بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دشمنی شاید بہت سا ڈانڈہ میں ہستی کے لوگوں تک پہنچا دی تھی، اسی پہ چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد  
 مغرب تک کے وقفے میں ان کا ذکر ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دور پگھلائی پر آ بیٹھے اور دور ہی سے دعا کی تھا کہ دعا کے وہیں پٹ  
 جاتے۔ سب اور دعا کا بھی کتنا پڑا، کیسا ارلی، ابدی رشتہ ہے۔ جاے کائنات میں دعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا سن؟ میں دن بھر خود کو  
 یہاں وہاں ابھرنے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کر رہا تھا "مگر شام دھلتے ہی اس کی یادیں کای رات کے سماجوں کی  
 طرح مجھے گھیر بیٹھیں۔ جاے وہ کیسی ہو گی۔ واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا پڑ پڑو کر م شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دشمنی  
 ہو گی؟ کچھ چروں کا خس صرف صرب کھانا چاہا ہے "کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دنگی چو گئی "شش اور حسس ہو چکی ہو گی۔ کاش،  
 دیا کے کسی جڑ کے پاس تو دور بستر ہوتا، جو ایک ہی چڑ کے میں ہمارے سارے جسم سے نیا دودھ کا سارا ہر کان پھینکتا۔

انگلے رور مہر دین کے ساتھ ایک دوسرے کا بھی کھنکھاتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا "یہ شکور دین ہے  
 سائیں لوگو پناہ شکور، اس کی قوا کی کو بڑے رور کا بخار ہو گیا ہے۔ مگر آپ اجارت دو تو دعا کے لیے سے یہاں سے آئیں"۔ میں  
 نے ناگوری سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ "میں نے اسے بہت سمجھا دیا ہے سائیں، پر یہ بھلا میری  
 بات سمجھتا ہی نہیں۔ کہتا ہے سائیں سے رور، دعا کی درخواست کر دیکھو۔ بڑھیا رہے ہے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔  
 زور کی دعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جاں چھوڑیں گے اس کی"۔ میں نے جاں نھوے کے لیے کہہ دیا کہ میں دعا کر دوں گا، اگر تم دن  
 تک لڑ کی کی طبیعت نہ سنبھلے، تو اسے لے آنا۔ ان دور دور کے علاقوں میں جوں لڑکیوں کو مختلف گھریلو و معاشرتی مسائل کی وجہ سے  
 ہسٹریا کے یا دیگر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں جن کا دور یہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شکور نے کی ہو گی بھی ایک آدھ  
 دن میں بھی چٹکی ہو جائے گی "مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب شکور سیاہ چادر میں ہنی گم قسم ی  
 ایک لڑکی کو سہ کر میرے ٹھکانے پر پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے حاس میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادل غواستہ دکھا دے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ گلابی شام کے ڈھلنے سورج کی کرن سے سکینے کے ناک کا لوٹک پلہ بھر کے لیے چمکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ افس۔ کس قدر دریاں سمجھیں تھیں کسی برہادر شہر کی طرح جس کا سب کچھ ٹوٹ کر جاتے ہوئے لٹیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان طعنی آنکھوں سے۔ شکور ہی دھس میں بڑے جارہا تھا "کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک تھا کہ تھی۔ ہنستی ہنستی تھی ساری سکھیوں سمیت پورے گاؤں میں دوہم چاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانوں سے، باغوں میں خوب لے لے جھوٹی تھیں ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کد کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ پھر۔ جانے کیا ہو۔ رات رات اسے چپ لگتی مٹی ساری مٹی اور تینے کھو گئے دریاہیں ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان لڑکیوں کو شام ڈھلنے کے بعد دریاں جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی دریاں اور سخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چٹ کیا ہے۔ بس سائیکس جی ب تھہری دغاں کا آس رہے کچھ ایسا پڑا کر پھوٹو کہ میری سکینہ بھرے پہلے جیسی ہو جائے۔" اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دوسروں سے لاقطع سی بیٹھی تھی، مٹی، مٹی، مٹی پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی، "ذہنی شام میں، اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے اس پاس کے ماحول میں سرسوں کی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بتا کچھ کہے چپ چاپ دغا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میری دیکھ دیکھی پہلے شکور سے اور پھر سکینہ سے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیے۔ خود اپنے لیے دغا، تھی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکور سے کہتا "تو کسی بھگتے حکیم یا طبیب کو رکھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دغا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔" شکور سے آہ بھری "آپ ٹھیک کہتے ہو سائیکس جی، پر یہ پگل کسی کی سلتی کب ہے، میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاحب نکار کر دیا اس سے، کہتی ہے، اس کا جو ہونا ہے، دھری ہونا ہے۔" میں نے فوراً سکینہ کی طرف دیکھا "کیوں لڑکی کیوں تنگ کرتی ہو اپنے برہمنوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی؟" سکینہ میری ڈنٹ سے گھبراہٹ ہوئی "جی۔۔۔" مجھے لگا کہ پہنے تانا کی وجہ سے وہ ٹھل کر بات نہیں کر پارہی تھی سر جھکا کر اس تناہی بول پائی "ٹھیک ہے جی۔۔۔" آپ کہتے ہو تو مان لوں گی "شکور خوش ہو گیا" دیکھ سائیکس میں جانتا تھا اس کا علاج تھہرے پاس ہی ملے گا۔" شکور اسکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر جانے کیوں نہ دوسروں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی دیریں جانی سپاہ بڑی بڑی آنکھیں پہنے اس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی ردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج نکلی لہجے "مان پر وہاں دھو دار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اس کی آنکھوں میں رہا ہے بھر کا وہ کرب کیا تھا؟

اگلے صبح مہر دین نارہ پانی کی مصروفی لایا تو اس نے خود ہی شکور سے کاد کر چھین دیا "کل سے دریا سکون ہے یا زوں کے گھر میں کسی ہنستی بوقت چڑیا کی تھی بے چاری سکینہ اب تو جیسے منہ میں رہا ہی نہیں ہے اس کے۔" میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔ "اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے۔۔۔" اس کی یہ حالت کب سے ہے؟ "تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کروا کر بڑے پھیرے لگائے ہیں شکور نے

"اس پاس کی ساری بستیوں کے کوئی مزر کوئی رگاہ نہیں چھوڑی، جہاں اس نے دغا کی ہو، علاقے کے سارے وید، حکیم، وید، طبیب بھی تھک کر دست ہار چکے ہیں کسی نے شکور سے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لڑکی کو لے کر کسی دوردراز کی بستی چلا جائے، شاید ماحول بدلتے سے کچھ بہتری ہو، مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار شکور سے کو وہیں نوٹائی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دغا سے علاقے میں ہارش برسی تھی اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکور اداس لانا تھا اپنی سکینہ کو لے کر۔" میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا "کہاں لے گیا تھا شکور دین اپنی لڑکی کو؟" "شکور گڑھ، وہیں ریٹو سے پیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے، اس کے دادا کا۔" میں چونک سا گیا یہ تو وہی علاقہ تھا جس کے پیٹ فارم پر جانو کا کہیں واقعہ تھا۔ "کتنا عرصہ رہی وہاں سکینہ؟" "لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس تھلی کامن نہیں لگا بس وہ بھر بیٹھی آسمان کو بھتی رہتی تھی۔" پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اس ہو گیا "اور پتا ہے سائیکس جی کبھی کبھی تو بالکل جو گھنوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔" مہر دین کی باتیں سن کر میرے اندر کی بے ہنگام مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکور سے کو میرے پاس بھیج دے۔ سر شام ہی شکور سکینہ سمیت آ گیا۔ "تھم سائیکس۔" سکینہ کہتی ہے اب؟ "شکور دین نے گھر سانس لیا پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیکس، ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈکنری کو بھی دکھانے سے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر ڈکنری کا پکا کالہ در وقت بیسے کے لیے۔" میں نے اپنے اندر بھرتے ایک عجیب سے موبوم حدشے کی تصدیق چاہی۔ "اب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تھے ماحول بدلنے کے لیے تب وہاں اس کا میل جو کن ہو گوں کے ساتھ تھا؟" شکور نے اسے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالت ذرا بیان کی "وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیکس جی وہاں بھی سارے دن گم فہم بیٹھی رہتی تھی۔" سکینہ اس وقت بھی ہم دوسروں کی باتوں سے لاقطع سے بیٹھی رہیں پر تنکے کی مدد سے اپنا پند یہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک نئی عمر کا جوڑا کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر رہی تھی۔ مردے منت کی "سائیکس جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار ہوں کا کھانا بھائی ہے۔ دغا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بیمار ہے سے تین دن سے۔" میرا پی چاہا کہ میں انہیں بڑی طرح دھتکار دوں میں نے مرد کو جھڑکا کہ وہ کسی ڈکنری کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیسے آ گیا ہے؟ مردے بتایا کہ وہ کالی عدا کر چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھ رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچی سکینہ نے دھیرے سے خود کالائی کی "ٹھیک ہو جائے گا مگر تک رہے اس کی مرضی سے، اس آج کی رات کی سختی ہے۔" شکور گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ



سرگوشی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی وراثتی دھبھی تھی جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑا بڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا جیسے بنا وہاں سے نہیں نکلیں گے۔ لہذا حسب معمول میں نے اپنے سدا کے حلقہ ہاتھوں کا کشکوں ہوا میں بلند کر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکور اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکور سے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے مدد کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا سرتار وار اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو، مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کبھی کبھک کھو بیٹھا ہوں۔

اگلے صبح سورج کچھ زیادہ ہی بارش سا نمودار ہوا اور پناہ گزینوں کی صورت میں سایہ جان داروں پر برسائے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا۔ "میرے کا کے کا بھار تر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم بچے تھے کہ اس جاں سے کری چھوڑے گا یہ بخار اس کی۔ بڑا ترپا ہے ساری رات ہسپر پر جیسے کوئی گھلی ہوئی پانی کے تڑپتی ہے۔ کچھ بتاؤں سائیں، میں تو میدان چھوڑ بیٹھا تھا، مگر پھر تمہاری دعا سے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا کچھ بھلا پن گاہو کر خد کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قرباں حادوں میں اپنے سونٹے رب کے، اس نے تمہیں ہم عربوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے اس سستی میں۔" دھوکہ میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جاسے کہنا کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکور کا بچہ رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفا یافتہ ہو جائے گا اور اس کی کبھی ہوئی بات نہ ہو وہ ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے دہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے سکینہ بھی "اسی دن دواؤں میں ہستی پہنچی تھی جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈال تھا۔ دوپہر ہی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش پڑی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی جیسے میں سے گیا تھا، جہاں ریو سے پیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑ ہو گیا۔ دوپہر اور دھوکہ شعلے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی، بارش کھل گئی تھی وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا پیچھا چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر دوپہر پلٹ آیا۔ سنے میں دور چلنے لڑی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے تپتی رہیں سے سختی سرب کی لہروں میں مجھے شکور کے گاہیوں دھیرے دھیرے لاشی ٹپکتا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سر جھکائے گھنٹری سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر سان کے دل اور وہاں سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر لشکارہ فخرے ادا ہوتے ہیں کہ "کاش! میں اس وقت کچھ اور انگ لیتا، تو وہ وہ بھی ضرور دے دیتا" مگر اہم سان بھی کہتے بھولے ہیں۔ بھلا اس سے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قیودیت کے سے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اس پر لشکر را کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں نہ لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس سے شکور اور سکینہ ہی ہی ہر چاہت، ہر دعا کا بدلہ نظر آ رہے تھے۔ شکور میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ "شہر کی بڑی ڈاکٹرنی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی۔ اس باڑی کو وہاں سے ہار ہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر اس وقت پر مل گئی تو رات تک وہاں ہی ہو گی اور نہ کھل تیری خدمت میں حاضری دوں گا۔"

سکینہ حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں نے شکور کے کو دوسرے درخت کے نیچے سنانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سینہ در اپنے کمر اور منھ سے وجود کو شکور کے پیچھے چھپا لیا۔ شکور سے سولی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی "کچھ ریر سستا، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گزہ کے اسٹیشن پر کھو کھانگائے واسے حاد کو جاننے ہو؟" شکور سے جوت سے میری طرف دیکھا "ہاں جی۔ وہ میرے داماد کا بھائی ہے۔ وہ ریو سے اسٹیشن کے باہر ہی تو کو رہا ہے میری بیٹا جی کا۔" اور اس علاقے کا چوہدری؟ "کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟" "نہیں جی، براہ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں، ایک آدمہ ہاں میں جب سکینہ کو لے کر دیامت پور کی بڑی درگا پر دعا کے لیے گیا تھا تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر دان کے ساتھ دعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دعا کرتے دیکھا تھا میں۔" اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکور کو ایک جانب بٹنے کا اشارہ کیا اور ہر ادارت سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید صمت گئی "میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی" "کون ہو تم؟"

(عادلی ہے)



ہاشم ندیم

ہاشم ندیم جو جوں مصل کے پسندیدہ، ٹلک کے معروف و معروف نامور نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ سے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہو۔ جنہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

’پری راز‘ ایک اچھوتے حساس و قدردانے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گد رسی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہ ہے جسے کم صورتی کے عیب کے جب اس ظاہر پسند، رو پرست دنیا کے سگت بد صورت رفتوں، بدبختی آنٹیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناؤں سے متعلق اپنی ’راز‘ سے ”گاہ کرناہر گرسنت جھولے گا۔ ہمارا ہندوئی پرانا ہے

ایڈیٹر، سنڈے میگزین، رور ہمس جنگ، شعبہ میگزین، جبار مرزا، آئی سی چندر، بکر روڈ، کراچی، ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میر مومن کر سکینے سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہویاں ڈلنے لگیں۔ سکینے نے گھبرا کر پے نا کی طرف دیکھ، جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑ کر کچھ کہنے کی کوشش کی ’سائیں یہ میری ساری‘ میں سے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”سکینے کو جواب دے دو“ سکینے مزید بول کھلا گئی ”دوستی میں تو اس سکینے ہوں۔“ جنہیں تم وہ نہیں جو ”نظر آتی ہو ساری دیا کو دعا میں دیتی پھرتی اور ان کے بے رب سے مانگتی ہو پھر خود کو اس جو گن کے بیچ میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیر بنی ہی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو درپے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولا، بولتی کیوں نہیں؟“ ”شکور امیر سے بھرتے بھرے لہجے کو میر جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینے بالکل روہا کی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں چھپایا پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید بھرتے میں میر سب کچھ زیادہ ہی تلخ و ریلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جاسے کس ریشم کی بنی ہوئی ہیں، لہجوں کی تیز و حار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی کاں دود ہاں اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود سے جلاؤں گا شکورے کا دل ہاں سے ٹھہ کر جانے کو کہیں تھا مگر میرے بچے کی حق سے اسے بال غرست غصے پر مجبور کر دیا۔ سکینے بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ وراٹھوں میں اٹھتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود سے بھی اپنی اس رعاؤں کی قبولیت کی کرمٹ کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر امیر سے، میرے کہنے لگی تھی حانے یہ اتفاق تھا میری تقدیر کا ایک اور مذاق مگر کچھ بھی تھا کہ خانو داسے پیٹ فارم سے جہاں میرے ہاتھ پر جوگی سائیں کی ٹھہر گئی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینے موجود رہی تھی جہاں لوگ میری دعا کی قبولیت کے لیے بھٹکتے رہے تھے وراج تک ان سب جگہوں پر حواسمیت جس ضرورت مند کی دعا بھی قبول ہوئی، ’اصل وہ سکینے کی دعا کی بددست ہی ٹھک ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ذاتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مرید بننے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ اس کی یہ دعائیں ایک مذہب اور رازی لاک کی سازش کے بدلے قبولیت کا رکنک تھیں۔ اگلے ایک دو درمیں میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے بھائیوں کے سامنے ہر محالو کی عربی اور ہندی معاشی مشکلات کا دربار دیتی رہتی تھی اور خانو کا باغ ٹھہنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینے کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ مگر خانو کا باغ ٹھک جائے، تو اس کے اس پھر جائیں گے خشک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چودہائی کو اوود کی خواہش ہے جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنائیں مذہب حال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہو؟ کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جوگی سائیں کے لقب سے ’لوگوں کو سکینے کی اصیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟‘ لوگ تو درکنار خود سکینے بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی ’ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سانیوں ہوں اور جوگیوں ہی کو اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں‘ کوئی ساجھو جو گن پابلی ان کی نظر میں دکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ کچھ کہتے ہیں یہ دیا مروتے ہنی جاگیر سمجھ رہی ہے۔ کوئی رجبہ ’کوئی عہد‘ کوئی شست بھی تو جان نہیں چھوڑی، اس نے جو کی مٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سپرے کی طرح بھلا ہوا تھا سکینے کو یہ عر ر کب اور کیسے حاصل ہو کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے جان بدوشوں کی ایک ٹوں کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ذیرے سے کچھ پرے اپنے جیسے گاڑیے اور شب ساری کے سپہ آگ کا لادروشن کرپا۔ ان کے اوپر سے میرے پاس جازت دیے آئے کہ گریجھے ناگوار خاطر ہو توں کا معمول رات دیر گئے تک صوبہ کلام اور کانیاں گائے گائے، میں سب نہیں کیا جاتا کہ کبھی میرے گھر در گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کر تاقہ موہنتی کا ہاری زندگی سے کچھ عجیب سادشت ہے۔ ہم کبھی سے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر پناہیت ہیں۔ حرام و حلال کی تقسیم میں دیا کے بڑے بڑے گوینے سرت سے جاں بھڑے کے بعد بھی کسی۔ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ بڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو عقیدہ اور حد یہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں کچھ صرف صوبہ۔ کلام کی لے پکڑ لیتے ہیں ’گویا جگڑاٹر سے نہیں سمجھتے۔ سے ہے اُسے کا نہیں صرف تاں کا ہے۔ میں جب دینی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور عمر بلی ڈان سنی تھی۔ یہی حال میرا تبیں کی مسجد کے ایک مزار کی خوش الحان سن کر بھی ہو تھا۔ سکینے اور کہ قدم جگڑ کر رکھ دے۔ اسان خود بہ خود وحوت دے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دینی کے ایک مصان کی تراوت میں سورکار جان کی تلاوت میں کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانوں کا قتل ہاری روح کے کچھ رجاگوں ’خیر کے کچھ ریشوں سے بھی بڑ ہوتا ہے‘ جان بدوش قہیے کا وہ خوش الحان بھی بہت عریض تھا، بابا یسے شاہ کا کلام گزودی کی قہاپ پردات کی خاموشی میں شر بکھیر رہا تھا۔

جا دس دے دلبر مانی لوں  
میگوں یار بھلایا جاندا نہیں  
مر دکھ کے یاروے قدماں دوج  
مر فیر اٹھایا جاندا نہیں  
میرا دس اک اے ’میری جان اک اے  
میرا دین اک ’میرا ایمان اک اے  
جدو رب رسول قرآن اک اے  
دوجا یار بنایا جاندا نہیں

میں نے کیا خوب کہا ہے کہ گھٹائی روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رہنے رخنوں کا رہنم کیا ہے مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

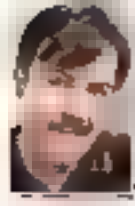
کہ وہ اور مانگ کی یہ اور جنگ ہم مجبور 'کھردور درجے میں انسانوں کو سو دو حضوں میں تقسیم رکھتی ہے 'ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ وہ' کے 'مجھ جیسے پرری ر دین جاتے ہیں، میں کب بچاؤ جس کے لیے نہ کبھی زمین میراں رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے تب ہی میرے قریب سے ایک مدام سی آواز 'بھری' آپ رور ہے ہوسا میں جی ۹۹' میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں 'سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے اس پاس نظر ڈالی 'ہستی کے بہت سے گھر نے جانہ بدوشوں کے جنگ رتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہرزیں اور شکار اچھی بیٹھے سر اٹھتے نظر آئے۔' ہاں کچھ یاد کر کے آنکھ بھرتی۔ تھہری آنکھیں بھی تو ہر لمحہ چھلکنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟' مگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو۔' سکینہ سر اٹھ کھائے بیٹھی رہی شکار سے نے اُنھ کو میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہرزیں سے سے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ دھار دیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہرزیں بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے نانا کے سامنے ٹھکل کر رہا نہیں کھولے گی۔ سکینہ سے گھٹی گھٹی، 'میں کہا' کچھ نہیں ہو ہے مجھے سہیں جی۔ میرے گھر والے تو بس ایسے ہی ہلکا ہو رہے ہیں۔ خود ہی دس ٹھکل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہوتا ہے؟' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا 'پھر ایک دم وہاں کیوں تپاگ دی تم نے 'جو گن کیوں میں گئی ہو؟' سکینہ نے ہل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں 'جو گ تو پ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی۔' سب سے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا؟' میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم در نادان تھا اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی 'دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی ک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے 'یہی عشق کا فرما رہا ہے 'بر عذاب کے در پردہ' ہی بچاؤ کے شتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے ہر رخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بتا دیتی ہے 'جوگی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے 'فقیر کے بہر روپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی ی محبت کے بارے بد نصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل رنڈہ کی تھی جس کا دل پارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی مجھوا ڈالنے کے لیے پھلے لگتا تھا ہو کی سرگوشیاں جس کے ان کو گد گداتی تھیں وہ بھر کے لیے ٹھہرے بادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ہی ایک کان رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری نو کریوں میں باغ سے آم بچے کر جمع کر رہی تھی، تب ہی سے عداوت کے ایک گہر و، ساوس نے دیکھ لیا۔ ساوس علاقے کے مہرور کا پڑھا لکھا اور سمجھا ہو بیٹا تھا، جو شہر کی بولی درستی سے ہم سے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر گنڈو سے کی ضرورت نہیں رہی 'کیوں کہ وہاں سے قدم جھنکی چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے محوں میں طے ہوئے گئے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ ہر راہ میں ہے۔ مشین ہماری مدد کی پر حاوی ہو چکی ہے محبت کی روپی داستانوں کو لوگ گردے دلوں کا قفس کہتے ہیں۔ پیر، خج، سستی ہوں 'سو ہی میٹوال در شہر میں فرہاد' الف علی کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہوئے لگی ہے۔ ساں عروج کی کتنی منز میں طے کر چکا ہے 'مگر پہلی نظر پہنچ بھی پہنچے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات پچھنے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے انک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کون تریاق دریافت نہیں ہو 'نظر کے ربر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جزیی ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لاکھ انکار کریں نہ سکے مذاق اڑائیں 'مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چوٹی اس کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری رنڈ کیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور ساوس کے ساتھ بھی ہو۔ دونوں ایک بار طے اور پھر جیتے ہی گئے۔ مگر عالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے 'سات سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو یہاں بھی وہی ہو۔ علاقے کے کسی بندے سے سکینہ کو ساوس سے ملنے ہوئے دیکھ یہ بات پھیل گئی۔ ساوس باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبر دار باپ کی نایک حزار ع کے گھر رشتہ لے جانے کے آئے آگئی ویسے بھی علاقے کا پٹوار ہی ہنی بیٹی رضیہ کو ساوس کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبر دار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرے کا خواہاں تھا۔ ر خوشکل و صورت میں بھی چند سے قریب، چند سے ہاتھاب تھی 'اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے ساوس میں رہا تھا وہ تو اس کی بونی درستی کی چھٹیوں کی دعا میں، کتنی پھرتی تھی، ناکہ اس کے دس تھر کا شہر دو دواہوں گھر بوٹ سکے 'مگر جب اسے پتا چلا کہ ساونل در سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں 'تو اس کے سینے پر پہ یک وقت کتنی سانپ بوٹ گئے 'جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ اور نہ ہر دوسری آفت آ کے گر رہی جائے 'ہم اس کی تہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جسے لاڈ سے سارے گھر والے رجو کہتے تھے اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بہتی بھر میں صرف وہی، ایک ساونل کے جوڑ کی ہے 'اس کے خوس کے چاند کے سامنے بھلا کسی در کے روپ کا چراغ کیا جلتے گا 'مگر اسے جو سوچا تھا 'سب اس کے الٹ ہو رہا تھا یہ معمولی سے قحی کمین گھر سے کی سکینہ کہاں اس کے سہوں کی تجوری پر ڈکا ڈئے گئی تھی۔ رجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیراب چینک کر اسے طر بھر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے اچھے نوجواں کو اس کے بھر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں 'عالمے دیہا میں محبت پہلے اتنی تھی ہر قابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سائیں بد کر دینے کی فکر میں گھٹا رہتا ہے۔ رجو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی مراد آئی۔ ساونل کی ماں سے اس کے سامنے پتا دینا! ال دیا اور سہوں نے اپنی چادریں پھیر دیں کہ ان کی محبت اور ماں کی خاطر دور جو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دیا میں چور درڈا کو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈکے ڈالتے ہیں 'مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈکایہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ 'بھن بھائی اپنی محبتوں اور محبتوں کی ذہائی دے کر کسی پہنے ہی چہیے کی محبت ٹوٹ کر رہتے ہیں۔ ساوس بھی باپ کی ضد ماں کے آسوں اور سہوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باتوں میں سے ایک بات تھی مہر دار کے بیٹے کی۔ ساونل کی جگہ کیا چڑھی سکینہ کے دس کا دریا ہمیشہ کے لیے اتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے ساونل آخری بار سکینہ سے ملنے آیا 'اس نے سکینہ کو پہنے دس کی حالت بتائی در مجبوروں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ بی ماں در سہوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جس کے نمود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت غم بھر کے لیے گردی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ چپ رہی۔ محبت میں محرومت ہنی مجبوری بیان کرے تو اس



پر دیا بڑے سخت لڑکھات لگاتی ہے۔ بے دھانی کے طبع اور سنگ دلی کے طعنے کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے پہلے رشتوں کا دوا دار، رومہ شناس و ر قلعس کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے شکر گائے جاتے ہیں اور رومہ اسے اپنی پتلون پر بٹھاتا ہے۔ سانوں بھی رتج کی پتلون کی ڈولی چڑھ گیا سار گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور بھلی جوڑی دیکھنے کے لیے مڈیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو جدا بہتر جاتا ہے، مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانوں اور رتج کی نظر یک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رتج بے جب شادی کی رات سانوں کے گھر میں پہل قدم رکھا، تب ہی سے سانوں کی ماں، بہنیں، رتج پر صدقے داری جاری تھیں۔ نصف شب تک رتجیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں سے پہلے در شہر اسے کی بارات کا پر رمان جی بھر کے پور کیا۔ سارا محلہ سانوں کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول بتاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا ان کے قہقہوں کی آواز سکیہ کے گھر کے گھر تک بھی آ رہی تھی۔ سکیہ کا دل بھی۔ پھٹا گراں ہنی کی آوازوں میں خود اس کے پنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ جگر کیسے چھلنی ہوتا ہے در جیسے سے چلتے دن کا دھواں کیسے لگتا ہے، جب پناہی سانوں کسی اور سہاوری کے ساتھ شب عروسی منا رہا ہو۔ سکیہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر سے یہی چپ گئی کہ وہ اس کی آواز سننے کو بھی نہ س گئے۔ جسم کے اندر بیتا حوں سو کھتا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکایا کارشت کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکراتی ہوں گئی۔ محبت جب سنان کی شریانوں اور ہستی نسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جائے پراہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہ کر ہی خشک نہیں ہوتا، کبھی کبھی تسوں کے اندر بھی اپنا ہوا کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن۔ دن لاغر اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں، مگر مرض کا سرا نہیں ملتا، مریض سو کہہ کر کاٹا ہو جاتا ہے در یہ ظاہر پارسست حکیم اور وید اس کھوج میں گھٹنے رہتے ہیں کہ آخر پتا کوئی چوٹ لگے، پتا کسی بیماری کے، اس مریض کا در دن دن یہ اب کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گاؤں کی شرفی پچا ہنٹ میں کیوں بد رہی ہے، جسم کی شادی خشک ہوتے پنے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکیہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر سب چارہ دے کے اندر در وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں گن تھا۔ ایک آدھ بار قہے کے باز رہا کسی در گاؤں حرا پر سکیہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں پڑ گیا یا شاید وہ سکیہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکیہ تھی ہی نہیں جو کبھی اس کے دل کی رتی تھی۔ سکیہ بس سانوں کو دیکھتی ہی رہ گئی در وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بکا اور بچھا تھا اس کا محبوب، مگر رتج کو کسی لو کرانی کی رہائی میں غمزدگی خبر نہی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہو، جیسے سانوں اب بھی چھپ چھپ کر سکیہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے محبوب کا در جب پائے کے بعد بھی اس کے اندر پنے سدا کے ٹھوک و شبہات کبھی اسے اس اعرار کا حق در کھن بننے دیتے، رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈکا رہا ہوتا ہے اس لیے وہ ساری زندگی خود کسی چوری سے ڈر تار جاتا ہے۔ اس کی میدیں پنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جن در حسد کے ساپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رتج بھی کسی ایسی ہی پیش کا ڈکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سالوں سکیہ پر مارتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر سوچے پچھے۔ کوں جائے کب سانوں کے دل میں پھر سے پراں محبوب کی محبت جاگ اٹھے۔ رتج سوچ سوچ کر ہلکا ہو گئی، تو پھر سخر کار اسے وہ خوف تاگ لید کر نائی پڑا، جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے فنا کر دینے کا لید، جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رتج بے عدالتی کی نیار کی رسم کے مطابق سناں دودھ خرید کر ساری ہستی میں تقسیم کر دیا۔ البتہ اس بات میں بس ایک فرق تھا۔ سکیہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر عدالت کے سب سے سرے سامنے کار ہر حاصل کر کے چند بوجھیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکیہ کی ماں نے مٹکی کی مٹکی سے دودھ نکال کر کنواری سکیہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



پاشم سرمد

شعربند، جوں سل۔ پشورم ملک سے معروف، ممد، ہمارے ہاں کا ہیں۔ اسے نامور حد اور محبت اور انہیں ہا  
 ۱۰ نمبر سے ہیں۔ "قوی پرانی حاضری تو ملک و ملت سے گہری میں شائع ہوا۔ ہوں ممد اور انہیں قوت سے پشورم  
 "اس کا حاصل ۱۰ نہیں۔ ان کی اپنی خدمات پر حکومت پاکستان نے ان کو "قوی پرانی حاضری" سے انہیں  
 "عبداللہ" نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

"پوری را" ایک چھوٹے حساس اور اندر سے مضامین پر مبنی سب سے گہری اور ندرت سے ایک نئے شخص کا حصہ ہے  
 - ہم سوچتے ہیں کہ سب سے گہری اور ندرت سے ایک نئے شخص کا حصہ ہے۔ انہیں ہا  
 سے متعلق اپنی تمام سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیں گے۔ ہمارے ہا

پشورم سے گہری ہیں۔ ہمارے ہا

sundaymagazineonlinegroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی سرایتوں، ڈن کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور نئے دورہ کی تاثیر ہی سے کچھ  
 کے لیے اس کی نڈھال کی ڈالاری تو نائی محسوس کرے۔ سکینہ سے دودھ کی کنوئیں نکال کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے  
 بوڑھے باپ کے کھانے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری ڈالاریں کر تو چھوڑ کر کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھٹا گئی۔ یہ تو سانول کی  
 آور تھی۔ ہاں۔ اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے اوچھڑ کر رکھ دیئے تھے۔ سکینہ کے ہاتھ میں کنویری کچھ ایسے  
 لڑی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینہ نے کنویری پیچ کر کھڑی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سننے لگی۔  
 پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینہ کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرانی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا  
 چلا کہ جگے جگے رہاں تک آگئے۔ سانول سے سکینہ کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کون کے گھر آنے کا ایک فرد سمجھتا ہے  
 مگر سکینہ کا باپ بعد ہو گیا کہ سب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو وہ گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر نہیں عزت بخشے۔ سانول نے  
 اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک تپلی۔ سکینہ کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے دھار کے روپ میں دیکھنے  
 کی خواہش مند تھی۔ سے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم یہ سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں در کچھ تو  
 تھا نہیں پیش کرے کے لیے، رنجو کے گھر سے آئی دودھ کی منگلی ہی میں سے ایک کنویری نکال کر سانول کو تھما دی۔ جو اس سے ایک  
 سانس میں حلق سے نیچے اتار لی اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ سکینہ کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروڑے  
 تنک بھی۔ ہاتھی پاتا تھا کہ بڑ کھڑا کر دیں گے۔ سارے گھر میں بھونچاں مچ گیا۔ سبھی سانول کی جانب ہلکے، سکینہ بھی ساری لاج  
 شرمینہ کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خوب کی ایک پتلی سی لکیر سے زمین پر گلاب نکھیر دیا تھا۔  
 سانول اور سکینہ کی نظر آخری بار ٹکرائی، ان دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی آوازی تھی۔ سانول کو کچھ کہے اور سکینہ کو کچھ سننے  
 کی صہت ہی نہ ملی اور سانول سے وہیں سکینہ کے سامنے دم توڑ گیا۔ ایک قیامت آگئی، سکینہ پر تو جیسے سکت طاری ہو گیا۔ سکینہ کے باپ  
 اور گھر کے باقی مردوں کو ملاقات کی پوچھیں قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔

رنجو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس سے نیچے بھری میں صحن میں بیٹے کوئیں کی منڈیر تاپ کر گہرائی میں چلا تنک لگای۔  
 خوش قسمتی سے گھر کی نوکرائی سے بروقت اطلاع کر دی اور رنجو کو رمدہ کوئیں سے نکال دیا گیا، مگر درندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس  
 کی روان اور دل کے دھڑکنے کو رندہ کی کانام کیوں دے دیتے ہیں لوگ۔ سات دن بعد رنجو کا سکتہ نونا تو وہ پکلی بار ٹوٹ کر روئی۔  
 سے پتا چلا کہ سکینہ کے گھر والوں سے جن در حسد کی آگ میں جلتے ہوئے سانول کو دودھ میں رہا کر مارا۔ ساری سبھی سمجھتی  
 تھی کہ یہ حرکت سکینہ کی ہو سکتی ہے جس پر پردہ؟ سے کے لیے اس کے گھر والوں سے خود کو قربانی کے بحرے کے طور پر پولیس کے  
 حوالے کر دیا، تو رنجو نے اپنی عدالت کی پردہ بھی نہیں کی، اور سیاہ چار اوڑھ کر سکینہ کے گھر پہنچی گئی۔ سکینہ در رنجو کچھ دیر کے سپہ ایک  
 دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں اور پھر رنجو یوں پک کر سکینہ کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے چھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے  
 پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانو سیلاب آ گیا۔ صرف وہ دونوں ہی، یا میں ایک تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ ان  
 دونوں کا محبوب اُس سے پھڑک گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے پھڑکے کا دکھ بھلا کون  
 جانتا ہے۔ یہاں محاورے تا نہیں حقیقت دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں ہی کرب کی کاٹ اور جان بوجھ ادب سے واقف تھیں۔ رنجو  
 سننے پوچھنے کو پتا چلتا تھا، ریکارڈ کروایا۔ سکینہ کے گھر واسے رہا ہو گئے اور رنجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھٹی سے سکینہ  
 کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ تنہا کر ٹھہری ہو گئی۔ ایک ایسا پارہیں ہی گئی جس سے چھو کر دھوا تو ہوا، سلی بھی سونا جتی گئی۔ اسے شاید یہ غم  
 اس لیے مل کر اس سے خود اپنے لیے دیا ترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی، غم یا اس کے لب جب بھی کھینے، صرف اوروں کے  
 لیے ہی کھینے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ دھماکتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے عدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم  
 خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس صحرائ پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر ذرا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب داخل چکی تھی۔ خانہ بدوش بخاروں کا جلا پڑا ہوا ڈسٹر پڑ گیا تھا۔ بخار سے ملنے آخری تان لگائی اور محفل پر غامت کر دی۔  
 جانے اس نے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بخارہ ہوں اور وہ مجس سال کسی چاند گھر کی شہزادی تھی۔  
 بخاروں کی چٹکی شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ منی کے کھلووں کے بدلے روپ کا سونا کون بچتا ہے؟ روپ کے سوارے صرف روپ  
 کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے روپ، بد صورت ہوتے ہیں، اُس کے ہاتھ صرف حاکم ہی آتی ہے، حاکم کے بدلے حاکم شکوہ  
 اور مہر دین سکینہ کو لے کر واپس جاے لگے، تو میں سے شکوے سے کہا۔ "اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری  
 یہ خواہش ہے کہ تمہاری بوی نیسے ہو۔ در پھر سے عام رہ گئی۔ "؟ شکوہ اثر مند کی کے مارے سر جھکانے کھڑ رہا۔ مہر میں نے  
 اس کی ہدای کی۔ "یہ ساری بھل بتانے کی باتیں ہیں، میں جی اثر مند کی ہی شرمندگی ہے۔ در پھر تم سے کون سی بات سمجھتی ہے سائیکس ایہ

بناؤں تو بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈوٹی پڑھ کر اپنے ڈسے کے ساتھ رحمت ہو جائے، اس کا بھی گھر بار ہو، بال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی۔ اس قسم دعا کرو دھاری سکینہ کے لیے۔ "میں نے سر جھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالا۔ "یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سامنے باپوں کی دعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جلد ہیں، مگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے خوش حالی اور پیچھے گھریا کی دعا کرے یہ اگر ہاں مگنی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب ہی کی خوشی میں خوش رہنا۔" مہر دین اور شکور اس جھکائے ٹپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اجالہ پھیلنے لگا۔ سورے سے گھڑائی اور انگڑائی سے رند کی جاگنے کا استعارہ جو زودیا گیا ہے۔ سکینہ کی ہستی بھی گھڑائی سے کر جاگ تھی، گھروں سے مرغوں کی ہاتھیں اور چھتوں کی چیمبوں سے رند کی کیویدیتادھوں آہوں کی طرف جند ہونے لگا۔ اس سارے دیہات، قصوں اور ہستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھلکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگتے ہیں، سرکئی، پچھلی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ ہستی کے اروہام در آنکوں میں ترے والی "میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے ساروں کی قبر کا پناہ پچھ در قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی تر چھ لکیریں لکھی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ ہر ایسی چاک میں سارن ہستی کو کھد کر کے انہیں یہ سوید ستاروں کے۔ نہیں اپنی اماؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا بھڑوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، دودھ تھ، ہتھیلیوں کا پناہ تو خود ان کی ہستی کے ایک کچے گھر میں روش ہے، مگر یہ سدا کے تو ہم پرست ہوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، دؤیر سے یا مہر دار کی بیٹی ہوتی، تو یہی ہوگ۔ "لکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی نہیں کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی خوشی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیر لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم اسان دعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے تنا جھگھکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کہی ہے یقینی ہے ہمارے مردہ یا شاہد بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں۔"

ڈیرے پر وہیں پہنچنے سے پہلے میں یہ ملے کر چکا تھا کہ ایک آدھ بھتے میں یہاں سے کوئی کرچاؤں گا کہ میں اب اس بھرتک کا بوجھ مزید نہیں اٹھ سکتا تھا وہیں آکر میں نے دو گھڑی سستاے کے لیے کمر لگائی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی مرغ سائیں دوڑتے، ہانپتا ہوا وہاں پہنچے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "سب حیر تو ہے کا کے؟" "پچھے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے قملی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں؟" کچھ نہیں سائیں جی اداوے نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں۔ بس اب میں چلا۔ "وہ جیسے آہ تھا، ویسے ہی تیز تیز پھل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ پچھے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست تنگ ہی ہوتے ہیں، اپنی رحیم خود ہی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا، دور وہ کیا سمجھا تھا، مگر وہ پہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ بڑ بڑایا ہوا سادا ہاں آن پہنچا۔ "ان دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں ڈور سے پڑی جا چکی تھیں۔ "سائیں جی سب خیر ہی صا ہے ناں۔" "ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں تنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو۔" "ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے نہ نہیں پائی۔" دوئی سکینہ نے آج صبح یہاں سے وہیں جا کر تہہ دے لیے بہت بڑا سنا دیکھا ہے۔ "میں اس پر۔" "بس اتنی سی بات ہے تم دونوں سکینہ کے بڑے پنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے گئے۔" میری رند کی پیٹھی کسی بڑے خوب سے کم نہیں ہے، جاو جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکر مند نہ ہو، کرو تم لوگ۔" کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ "لیکن میری اس بھگڑی کاں دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکور ہوں۔" بات ختی سادی نہیں ہے جی اسکینہ کے خوب بچے ہوتے ہیں سادے۔ جب سے ساراں کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خوب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ "میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔" "مگر تم دونوں تنے پریشان کیوں ہو، آثر اس نے ایسا کیا دیکھو یہاں ہے خواب میں۔" میرے پاس کھونٹے کے لیے اب ہاتی کچھ نہیں بچا ہے۔ "شکورے نے گہری سانس لی۔ "سائیں جی اب میں کیا بتاؤں تمہیں، میری تور بان حلقی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے مدد فحستہ تمہاری موت دیکھی ہے۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمار سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کھن، فن کا نظام کر رہے ہیں۔" مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکورہ گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کالی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے نہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خوب کی تعبیر تب سے سچی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں مردہ ستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے ارد گرد قفس کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہنے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی فتم ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تنگ چکا تھا اس بھاگ دوڑے، اب لمبی نیزہ سونے کوئی

چاہتا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موندیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں، مگر حشر تک کی امید شاید بھی میر مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چچھہا ہٹ اک نئی صبح کی بوند سے کرنی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ در تھی۔ ڈور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورنڈ گاڑی کا بونٹ کھلا ہوا تھا، درباریور سمیت ایک دوسرا شخص بونٹ پر ٹھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ تنے میں ایک تیسر محاذ قرض قرضی جوڑ سے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موز کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر چانک ایک مالوس کی آواز میرے وجود میں بجلیاں سی مہر دین۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ "اور کتنا دیر لگے گا کم بخت۔" سارا دن لگائے گا کیا؟ "میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بونٹ پر ٹھکا ہوا دوسرا شخص کبیر حال تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میر محاذ ہوا کرتا تھا۔ صاے وہ اس ویڈ نے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

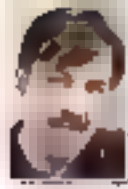


اپنا تک س کی نظر دور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رنگوں میں خوب مجھے لگا۔ میں کبیر سے خاصے پر میٹھا ہوا تھا اور میرے مامی اور جان کے حبیے میں رہیں آہوں کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہو گئیں۔ اس سے ہاتھ کے شامے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا مگر میں نے لاطعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ مگر کبیر جان نے میری طرف بڑھے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محاذ سے کچھ کہا اور محاذ سر ہل کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ چھوٹا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، دور دور میری آواز سرور پہچان بیٹا محاذ سے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ "بابا جی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ؟" میں نے بظاہر لاپرواہی سے تصویر پر ایک چھٹی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ "یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حبیے سے اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام؟" کون ہے یہ آدمی؟" محاذ نے گہری سانس لی۔ "یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چھ گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر ہم سب سے نہیں آ سوتے رہے ہیں۔" میں نے چار نظروں سے محاذ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں تھا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کسی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ سبہر حال وہ جو کوئی بھی تھا اس کے میرے قریب ہوں ورنہ کبھی بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے جان نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف نہ سکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی ڈرامی درملوں کے پیچھے میرے مامی کی کوئی جھلک نظر آ جاتی، بعد ازاں سے وہاں سے ٹھہر جاتے ہی میں بہتری جان۔ "تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی سبھی چیزیں ہیں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزر چکے ہیں، سبھی جگہ آنا حالانکہ رہتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، چاہے کہیں درگاہ کر دے میں ڈراؤں سے کہے بہ پالی بھروں۔" محاذ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے چھپ کر دیکھا تو محاذ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سو رہ گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، میکس میں کبیر جان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی وار مارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ "تج نہیں، تو کل وہ اس رستے پر سرور پٹنٹا۔ میرے دل میں یہ حدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھڑے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر جان جیسا وفادار تو کبھی تک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس سے بروہ جگہ پھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ذریعہ بھی مکاں رہا ہو گا۔ میرا ایک بار شدت سے چھلا کر میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر بیٹھنے کے بارے میں پوچھ لوں، پھر میں سے اپنی قسم دے کر مٹا بیٹھا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس باپ پر قابو پا لیا۔ کبیر مجھے پتے ساتھ لیے ہٹا کبھی واپس نہ جانا یا پھر خود بھی عمر بھر کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دینا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تارہ ہو گیا، میرے دل درماں میں "یادیں کبھی پڑانی نہیں ہوتیں، یاد مامی کو بھلا نا صرف دل بہاؤ کے کی باتیں ہیں، پاپا بہ ہم ساری عمر بھی اپنی یادوں سے فرار نہ کر سکتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے پاپاؤں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر جان کی آمد میرے لیے خطرے کی تھنی بھاری تھی۔ سب میرے یہاں رہنا ممکن نہیں تھا، وہ کبھی بھی وہیں پٹ نہ سکتا تھا۔ میں نے مہر میں کے درمیانے ٹکڑے کو بلا بیٹھا میری میدانے کے مطابق سکیر بھی ٹکڑے کے ساتھ چلی آئی، شاید ٹکڑے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکیر میرے لیے کالی فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "میری فکر نہ کرنا، میں بہت پیسے خرچ کرتا ہوں، اب صرف نقد ہی ہوتا باقی ہے، ہونے تو پنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور ایک بندے کو اپنا بیٹوں ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے سپہ وہ ذہری رہدگی جیسا بھی کسی حد پ سے کم نہیں ہو گا مگر یہ دیا سپہ لگے بدھے اھو سوں پر چلتی ہے، سو، جیب ویس ہے، ویس بھیجیں پٹالو۔" میں نے ٹکڑے اور مہر میں کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ سختی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں غم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد ٹوٹ آئے، کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے۔ جانے یہ آخری ملاقاتیں ہیں، اتنا جھوٹ ہوئے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ رکنے دے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔

مستند مد میرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے سس مل گئی۔ میں پُپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر ٹپک گیا۔ اس دیہاتیوں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی، کھٹے بھر چکے تھے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، آگے پوچھیں کانا کہ لگا ہوا تھا۔ دو پوچھیں واسے وپر چڑھ آئے۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ تنے میں ان میں سے ایک کی بھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر دور سے چلایا۔ "یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔"

(جاری ہے)



... ہاشم مدنی ...

ہاشم مدنی، جنوں سسل سے پسیدہ ملک سے معروف، مسند دار مار سہ ماہیوں نگار ہیں۔ ان کے نام، حد اور محبت + شہیں کا نمبر ۱۰۰ میں اقامتی پرنٹ حاصل کی تو ملک، مذکورہ نمبر میں شائع ہوا۔ وہاں ہاشم مدنی کی قلم سے پسیدہ و تین ماہی نگار، حاصل ہو گئے ہیں۔ ان کی اپنی خدمات پر غور کیا گیا۔ ان کے قلم سے وہاں پر فلم سے شہیں میں "عبداللہ" نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

'پری ر' ایک چھوٹے حساس درندہ کے مشکل موصاف پر مبنی بہت ہی عمدہ کی تحریر سے بہت سے شخصوں کی نگاہ سے گزرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے کتبہ صورتوں میں مدحیت آئیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیں گے۔ ان کا پتہ دہلی پرانا ہے۔

یہ ہے، "مذکورہ نمبرین" روزنامہ جنگ، شہد نمبرین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گروڈ، کرچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پوئیس دے کے اس طرح چلانے پر اس میں بیٹھے سارے دیباچوں نے گھبرا کر یوں پٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگی جیپا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کوئی سپاہی بد وقتس نے کھڑے ہوئے، مجھے اس سے اتار کر سڑک کنارے کھینچ کر لے گیا۔ مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پوئیس دے میرے قریب آئے سے کترار ہے جسے اور میری ہرجش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جی تھیں۔ پھر اسوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ لگا کر بند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک انسپٹر سرکاری جیپ میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کر کے بعد میں کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاموں پر سب سے پہلے ہوا ہے تھے کہ وہ انسپٹر ہے۔ اس کے ہاتھوں سے اسے روکا رہا دیکھا دیکھا اور کچھ کھس پھس کی۔ انسپٹر نے پیسے سر سے پاؤں تک مجھے کی بار بار دیکھا، پھر اپنے ہاتھوں سے پوچھا۔ "اس کی تلاش کی ہے؟" "نہیں صاحب جی، ہم جانچ دے" "لے کا انتظار کر رہے تھے۔" "انسپٹر نے مجھے سے نہیں جھاڑا، اونے اس دیرانے میں بارود چاہنے والے آکر تھہرا، دے کر آئے گا۔ ایسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خود کش ہے، جس کی نظری ہوئی تھی؟" "صاحب جی حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی بے بال، گھنی لٹوں، جھکی بڑی ڈھکی، سرخ آنکھیں، ملک کا بھیس۔ یہ تصویر دیکھیں ڈر۔" سب انسپٹر نے جیب سے ایک سادہ کاغذ پر بنا ہوا کہ لکھا کہ انسپٹر کو رکھا۔ ان کی باتوں سے مجھے تانا تو ہوتا چلا پکا تھا کہ انسپٹر عدالتے قاتل سے در ہے، اور وہ کسی خود کش کی تلاش میں یہاں تاکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہو میں کھڑے کھڑے اکرانے لگے، تو میں نے تھامے دار کو ہلکی بار مخاطب کیا۔ "مگر آپ اجازت میں، تو میں اسے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آ رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کر دے۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔" میری آواز اس کردہ سارے ہوس چھنے، جیسے میں نے واقعی کوئی خود کش دھماکا کر دیا ہو۔ تھامے دار میری بات سے زیادہ میرے بچے اور سٹکوں بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قہقہے اتارنے کو کہا۔ میں نے پنا پنا پنا ناچا لا اتار کر ایک جانب پیٹک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے ڈور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھامے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکلیں گس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھامے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ پنے اور گزری ملا تھا۔ تھامے دار نے جیب کے دائرے میں سیٹ پر اسٹین کسی سپر سے بات کی اور مجھے قہقہے پسنے کا حکم دیا۔ ڈور سے اسے سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کہیں نہ کھوکھے داسے تھامے دار کے لیے دھکی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک بوتل اور چند چھوٹے پرانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھامے دار کا دفتر بنادیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر در در عظم سے زیادہ تھامے دار کا کردار ہوتا ہے۔ نشان غلام پیدا ہو ہے اور سب غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا در کبھی اپنے جیسے سبوں کا۔ تھامے دار نے دروازہ کرم مجھے بھی سامنے میں اپنے سامنے رہیں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ "جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم در حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف سب اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمسایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو اس علاقے میں کسی کا سبب اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے حلیے سے میل بھی نہیں کھاتا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کوں ہو؟" "میرا دس چاہا کہ میں ڈور در سے قہقہے لگا کر ہنسوں، کل تک جس حلیے اور بھیس کی وجہ سے یہ دیا میری راویں پلکیں بھٹاتی تھی، میری طرف پیٹھ کر کے چلنے کو بھی ہے ادنیٰ سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جوگی کا بھیس مجھے ایک عادی مجرم ثابت کر رہا ہے پر ملا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلتے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص محنت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس ان کا پند نفیخ یاد دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی دت پر چالیس کے بند سے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیال میں تھامے دار سے پوچھا یہاں سے ریاست پور کتنی دور ہے؟" "تھامے دار نے محنت سے میری طرف دیکھا۔ "بھتیخہ میل، کیوں؟ مگر تم غلط کر دو، تھامے دار دس چالیس پر رہتا ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری صلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔" تھامے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیب میں بٹھا کر تھامے دار پہنچا دیا جائے۔ اس میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نو جوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خود کش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی مجبور کی طرح برت رہے تھے۔ خود کش، ہم بھی کیسے بد قسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری نعت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آ رہے ہیں۔ خود کش، دہشت گرد، درانداز، انتہاپسند، کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدور ہیں۔ ساری دنیا میں اسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات بٹھارہتا ہے۔ مگر تھامے دار نے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری نعت میں دہشت کش، محبت پسند، سکون، مدد رسانی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جتنا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھامے دار پہنچا دیا گیا۔ خلاصہ معمول تھامے کی عمارت باہر سے بڑی پڑ سکوں اور خوب صورت تھی۔ تھامے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی، جو تھامے کی عمارت کے آس پاس پھیلتے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہو گی۔ تھامے کے پاس منظر میں ڈور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ سے سونا پھیرا دکھاتا تھا۔ سڑک کے اوپر ایک چھوٹا سا بیٹوں کا پل تھا جو تھامے کے سرکاری چوٹی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھامے کی پران، مگر انگریز دور کی ایک پر شکوہ عمارت استادہ تھی۔ اس کے سامنے ایک عجیب بات محسوس کی کہ۔ ظاہر تھا ڈور دیو میں ایک جیسے جڑا اور مساحت کی بنی بیٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر انہیں غلط استعمال ہوتے ہیں، جب کہ دیو میں جدائی کی عمارت بن جاتی ہیں۔ پل لوگوں کو ملاتے ہیں در دیو میں جدائیوں ڈال دیتی ہیں۔ تھامے کی اونچی مٹی دیواروں سے بھی میرے ارد گردی دیا کے درمیان جدائی کی حسیل کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا، جو تھامے کے گھر میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم سب اپنے جیسے نہ لوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالت میں بیٹھا رہتا تھا۔ سپاہیوں اور دیگر سٹکوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

ریا دیوانہ ولی بگ سی چائے کا ایک بڑا۔ مجھے پکارا دیا۔ "جائے ہو، دہشت گردی کی سرا کیا ہے؟" اگر تم پر اہم ثابت ہو گیا، تو میرے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟" میرے بھری میں مجھے سکیر کی پیش گوئی یاد آگئی، تو گویا میری ٹاس دہشت گردی کے ٹرام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو بھئی سکی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھا۔ رارے میرے دروازہ کے طور پر ریاست پورے شہورے اور مہر دیں کو بلا کر میت کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان بچاؤ کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ مانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے سوارے کھل اور کسی بھی عقلی یا جھوٹ سے پاک نکلی ہے۔ میں نے اطمینان سے ایوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ تھانے میرے گرد اپنا جال کھل بن یا تھا۔ اب تو شکوں ہی شکوں تھانے میں نے آنکھیں موندیں اور وہ ناروا اچھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آئینگی۔ کاش! میں ایک بار سے دیکھ پاتا۔ میرا اس کسی ہاؤس بچنے کی طرح کھل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں۔ پھٹنے پر سے کپڑوں والے بچے۔ اپنی خانہ جیہوں کا احساس ہے۔ دس کو اچھی لگنے والی مٹنگ چیزیں۔ کسی کان کے بند شیشوں سے۔ پیروں لگ کر نکلتے ہیں ہاں۔ میں بھی تم کو یوں ہی محسن کٹر نکلتا رہتا ہوں۔

میں بھی اسی حالی جیہوں والے بچے کی طرح سے ایک بار نکلتے کی تس میں جاے کب ایوار سے ٹیک لگائے ہو گیا۔ مجھ جیہوں کے لیے یہ میدان خراب کتنی بڑی منت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پائے والے کٹر اپنے خوابوں میں غراویں پاتے ہیں۔ میری منت بھی خوب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرت گیری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کول ہاتھوں کی جادوگری سے میرے مجھے میں حائل رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک جسم لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی رہاں یا ڈسٹری کا کوئی لفظ بھی تو یہ نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتھ کر سکتا ہو۔ اسی صورت میں صرف نظری نظر کے لیے رہاں کا کام آتی ہے۔ میں۔ جاے کتنی دیر اس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بول رہا، در پھر کسی نے مجھے رور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔ "بھل بھی ملنگ بادشاہ۔" تھانے در صاب تھے بلا ہے ہیں "میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی مجھے جھکڑوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پریس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب سوار ہوا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند حاکمے بنائے گئے در پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جو ڈا گیا پھر ایک سرسے جو غور سے میں اس کی تھی، مجھ سے ٹپکی ہار اور است بات کی۔ "ریاست پور سے صرف تپا چلا، کہ تم نے کچھ سنے وہاں جتنی سے باہر درخت کے گراہے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟" میں دیر سے سے مسکرایا۔ "فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریوے پیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا۔ اب آپ کی یہ حوالہ ہے۔" اس نے اپنی ہونٹوں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "مگر تمہارا یہ سب دلچسپ، یہ اعجاز تمہارے دل سے گویا ثابت کرتا ہے۔ میں ابھرا ہوا ہے تمہارا یہ اعجاز میں جانتا ہوں، جن جگہوں کا تم نے بھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا اشتیاقی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کار پکار ڈا دیکھا جاسکے۔" میں نے کمرے میں بیٹھے ہونے پر لوگوں پر ایک گیری نظر آئی۔ "حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ جیسی کوتاہی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑ کھڑا جائے، اس کی آواز کا بے ادب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہوئے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور مگر کوئی بنا گھبرائے پناہ دیا جان کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ عذاب مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس روم سے باہر ہونا ایک صی ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔" آپ عیناں سے ہنسی مٹائی کریں۔ "میں خاموش ہو تو ان سب کے تھے ہوئے چہروں پر مزید کئی شکیں پڑ چکی تھیں۔ میں نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ دل سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ "میں اس شخص کی تلاش ہے یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے، ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے در بھی ملک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری دھوری کہانی ہمیں یہ سوچے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے۔ جاے کتنے نام اور بہرہ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملک کے جیسے میں نکھوتا رہتا ہے اور موقع پانے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ میکروں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک۔ لہذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری غرائفی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔ اس کا لہجہ اور اس سب کے شور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتانا، میں جس شناخت سے ساری غم بھرا گنارہ تھا، وہ ایک بار پھر میرا حق اڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ در کچھ نہیں، مگر وہ بعد کب مانے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالہ میں بند کر دیا گیا در لگے در مجھے صی کی بڑی جیل میں منتھ کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار در شہار کے درمیان علاقے میں منادی کرادی گئی کہ علاقہ پو میں نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شے میں پکارا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آکر پریس سے ملے۔

اکل صبح سب سے پہلے مجھے شہورے اور مہر دیں کی آدیں سائی دیں۔ پریس وے نہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھکار دے تھے، جب کہ وہ دیہات دے رہے تھے کہ پکارا جائے، لا کوئی دہشت گرد نہیں اس کا جوگی سامنے ہے، مگر وہاں کوئی ان کی نئے وال نہیں تھا۔ پریس والوں نے صبح ہی میری لگیوں کے نشانات کے کرجائی کے لیے بڑے شہر بھجوا دیے تھے۔ شہورے اور مہر دیں کو توڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو دونوں رو پڑے۔ "سائیں جی! تمہاں کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم دونوں جو یہ سمجھ رہے ہیں۔" میں دیر سے سے مسکرایا۔ "شاید میں وہ نہیں ہوں جو تم دونوں سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکیر کا دیکھا ہوا بہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔" دونوں میں میرے جھکڑوں میں ہاتھ پکار کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شہورے سے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دس سے سکیر سے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دنا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رورو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو سائیں جی کو ان سب کی طرح مانے، مگر سائیں کی آواز وہاں خائف جانے اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے ستری نے آکر رورو دار دار میں صاب میں کھڑ کا کیں۔ "نہ جا ملنگ بادشاہ۔ تمہاری رہائی کا پردہ" "کیا ہے۔" میں خیر سا حوالہ سے باہر نکلا تو تھانے والے مجھے اپنے کمرے میں بولیا، اس بار اس کا لہجہ بہت نرم در معذرت خواہ تھا۔ "صاف کرنا فقیر۔ ہم بھی اسان ہیں، ڈیوٹی کرتے وقت اونچ بوجھ جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے پردہ ہمارے یقین کا ٹکڑا کھڑ رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو بھلی سی شکایت بھی نہیں کی۔" تھانے دار نے چائے والے ٹکڑے کو چائے، ناشامیز پر بھانے کا اشارہ کیا۔ "تم نے کوئی شکایت یا گھ نہیں کی۔ اس بات سے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے نظر پرش کی رپورٹ بھی کلیئر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو جہاں جانا چاہو، جاسکتے ہو۔ مگر پہلے ناشا کر لو۔" میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر



تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ طلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“ کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی بھرپوری کا بہت شکریہ۔“ تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ”شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟“ میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ”ان سے کیسے گا یہاں نکلنا ہو؟، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں نکلی ہو گی، وہاں خود پہنچ جائوں گا۔ میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں۔“

میں اکرم خان کو وہیں بٹکا بٹکا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر دیہی ٹل اور دیہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف چلتی چمکنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تباہ چلتے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گزرتا کر بس پڑے۔ شریروندیں ایک بے گھر بھارے کے ساتھ آنکھ پھوکی کا کھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکتے لگیں۔ بادلوں نے بھارے کو بھینٹتے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں بند ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسادھار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سننے تو اسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے انکلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اونٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں ڈکا۔ بجلیکار ہا، اور بہت زور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی رستے میری تنہائی پر مسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی قہقہے کی کرسٹائی دنیا سے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے بڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھینٹنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی تل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ”کہاں جا رہے ہو صوفی! میں پہنچا دوں؟“ میں نے اس ویاوان سے پوچھا۔ ”یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟“ وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ”راستہ تو کہیں نہیں جاتا۔۔۔ سیمک پڑا رہتا ہے دن بھر فقیر۔۔۔ بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔“ مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے سن کی الجھنیں بھلا کر لبوں پر ایک جگہ سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ”دل والا“ ہے۔ تل گاڑی نے مجھے کچی سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے گاڑی کا سوار یاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے گزرتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بھار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے اٹھالیا اور بتا پوچھے ہی ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چڑا سی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بھار نے میرے حواس اس بری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کر دیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچتے ہی کسی قلی یا مزدور سے کہلو کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے دھنوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رکی تو میں بھی ٹی ٹی کو بتاتے لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ٹھکن کے مارے میرا ہر حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹپک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ مٹھی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے چلتے مجھے برقی پور ڈپرڈ پڑی، جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھکا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہ تو میرا پناہ شہر تھا۔ ہاں وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچہ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لا کھڑا کر دیں گریا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں فرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے ارد گرد لوگوں کا جھوم اٹکھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماشا بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ دوسب مجھے بری طرح جھاڑ پار ہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خود کشی کے ارادے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خود کشی بھی کتنا عجیب جرم ہے، جرم کا ارادہ ہوا اگر جرم ناکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز جھوم میں ابھری۔ ”ہندو دیہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ۔“ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔



باہم نہ ہم تو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن“ دسمبر ”نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سطرے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عہد اللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے قلمی عہدہ کار کردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عہد اللہ“ نامی ایک بین الاقوامی قلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے آن گشت بد صورت رشتوں، بدینیت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز عزت جھوٹے گا۔ ہمارا ہاؤس پر نام ہے:

ایڈیٹر، ”سطرے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چنور بکھروڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں کسی قدر جھلت سے کام لیتے ہیں، ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پرائیوٹ لائف لانا پڑے گا، اور ٹھیک اسی وقت بھیڑ کودھکیل کر اندر آئے والے نے میرا اندیشہ بک کر دکھایا۔ آنے والا خالق تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گرم صدمہ ہی رہ گیا۔ خود میں بھی اسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دڈ کر مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ ”کیوں قلم کرتے ہو ہم غریبوں پر سائیں۔“ کیوں ہمارے مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟“ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ”مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ اس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسب عادت کسی حوالہ دار کی طرح سب کو ڈانٹا ”جاؤ یہاں سے بابا۔۔۔۔۔ کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے، جو تم سارے یوں منہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، کام کرو اپنا، شکر کرو سائیں میں ادھر آ گیا ہے، اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے۔ چلو اب بھاگو سارے یہاں سے۔“ دیر سے دیر سے بھیڑ ٹھنسنے لگی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو یہی نے ضد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، لہذا خانو نے کچھ عرصہ قبل کسی سے سفارش کر دیا کہ یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کینن بنالیا اور اب وہ اپنی بیوی بچوں سمیت اسی شہر میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کھنکول میں مقدر بار بار دہی پرانے نکلے کیوں ڈال دیتا تھا۔ مجھے خانو کے غلوں پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا تھا، مگر۔۔۔۔۔ وہ میرا نانا دان دوست تھا۔ اور مجھے شاید کسی نانا دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھوکھو کھایاں بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رعب جتا رکھا تھا۔ خانو نے ٹھوڑی دیر ہی میں پلیٹ فارم کے ٹیڈ سے پرے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے پر گد کے درخت کے نیچے میرا ہمراہ بنا دیا۔ فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پچھلا پانا مچھیر، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش۔ درخت کے نیچے یہاں بھی گئی اینٹ اور سیٹ سے بے ایک گول چوڑے نے ہر گد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، بالکل میرے غلوں کی طرح، جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھبراڈالے رکھتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رکا اور میری سخت حالی دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”نہیں تو شاید شدید بیمار لگتا ہے جو گی سائیں۔“ ”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ٹھکن ہے بہت لمبے سفر کی، تم جاؤ یہی اپنے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، مجھے ابھی جاگنا ہے، اس شہر کا آسمان اور یہ تاریک میرے پرانے دوست ہیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں، ان سے مجھے آج رات۔۔۔۔۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبور اُدھاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جانے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اسے کچھ دیر مزید روک لینا تو اچھا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، اینٹوں اور سیٹ کی مٹی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہو گی، شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی بھسہ تراش رہی ہو گی یا پھر شاید اپنی صحت پر اپنی پسندیدہ زرد دھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا گگ تھا۔ میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں میچنے لگیں، تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔

صبح تک میں مزید نہ حال ہو چکا تھا اور جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا، تو حسب معمول سب سے پہلے ضعیف و اعتدیلہ لوگ ہی میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصہ رہا ہو گا، کیوں کہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا روت ٹھکر گڑھ رہا تھا وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ”کرامات“ کے بہت قصبے میں رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں فٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا ”یہ کیا تھا شکار کھا ہے، کون ہے یہ بھڑوب؟“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز سن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار ادھر ادھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا ”کون ہو تم۔۔۔۔۔ اور کیا تم جانتے نہیں کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بسیرا ڈالنا ممنوع ہے۔“ میں یہ مشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا ”بیسرے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب؟ شاید کینن ممنوع یا غیر ممنوع ہوتے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا، مگر بخار کی ٹھکن اور نکالت کی وجہ سے ایک زوردار پکڑ آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی ”ارے ارے۔۔۔۔۔ سنہیل کے بھئی، تمہاری طبیعت تو بہت ناساز لگتی ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر قلی دوڑے چلے آئے اور انہوں نے بھی مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے سکین پر بٹھادیا، میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تسلی دی ”نہیں، میں ٹھیک ہوں، میں خود بھی یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ دیر نہیں کھوں گا یہاں پر۔“ اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر خدا امت کے آثار تھے۔ ”نہیں نہیں، ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، کچھ لوگ اسی طرح چہتر ڈالتے ہیں اور پھر دیر سے دیر سے سرکاری زمین پر پہلے پچا چھوڑنا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں، مگر تم اس وقت اس قائل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکوں۔ کچھ دن آرام کرو، طبیعت سنہیل جائے تو چلے جانا۔“ میں نے ٹھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شہر مجھے گائے کو دوڑاتا ہے۔ آپ ایک احسان اور کردیں مجھ پر، یہاں سے کہیں بہت دور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروادیں مجھے۔۔۔۔۔“ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آپہنچا۔ سیرٹیفکٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔“ اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمبے کے لیے میرے پاس رکا ”اگلاز نام ہے میرا، فی الحال تم آرام کرو۔ میں ذرا دفتر کے معاملات ختم کروں، تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ذرا صبر سے کام لو۔“ اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب بیٹھے کی عادت ہی نہیں رہی، پھر چاہے وہ صبر کا بھل ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کے شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے حما گیا۔ ”یہ دو اینٹیاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں۔ جلدی سے یہ گولیاں اور شربت ٹھک جاؤ۔ ہمارے اگلاز صاحب نے ڈسپنسر کو رس بھی کر رکھا ہے۔ یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود ہی کرتے ہیں۔ شام کو ان کی جھٹک میں خوب بھوم رہتا ہے۔“ وہ باتوں ہی جانے کیا کچھ کہتا رہا اور تب تک وہاں سے نکل بلا، جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی، کچھ لوگ اپنے لفظ اسٹے بے دریغ کیوں لٹاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کینن کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ”سائیں جی، وہ کالو ٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آتے تھے تمہاری طرف۔ سب خیر تو ہے ناں!۔۔۔۔۔“ ہاں، سب خیر ہے، وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے۔ اچھے انسان ہیں۔“ خانو کے چہرے پر چھائی فکر مندی کی کبیریں چھٹ گئیں۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اگلاز صاحب کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے لگا کہ دیکھتے ہیں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں، مگر دل کے بہت اچھے ہیں، سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ جانتے یہ اوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے اتنے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تعقادات کا مجموعہ ہے۔ میں دن بھر وہی منہ ڈھانچے پڑا رہا۔ فضا بہت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوت پر داز نہیں دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوت ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہو تا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پکڑ کر کہی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا، مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔

شام کو اگلاز صاحب نے بھی دوسرا بھیڑا ڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے۔ بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے ہوتے، پھر یہ جو گگ کیوں لے رکھا ہے۔ کبھی معاف کرنا میں اس جی پتھیری یا فقیری پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج کل کے اس منافق دور میں اصل پتھر فقیر بھلا کہاں پائے جاتے ہیں؟“ اگلاز صاحب کے لہجے میں تلی گلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ”ٹھیک کہتے ہیں آپ، کاش اب چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آ جائے کہ صرف علیہ، درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ دیوانے اور مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اگلاز صاحب نے پتہ تک کہ میری طرف دیکھا۔ ”آدمی دل چسپ لگتے ہو۔ موقع ملا تو کبھی تھیلے بات ہو گی۔ تم آرام کرو۔“ اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی زور اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو پک کر میرے قریب آ گیا، ”کیا کہہ رہے تھے، اسٹیشن ماسٹر صاحب! میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔“ ”ہاں کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن ادھر کی ادھر لگا رہتا ہے، دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔“ میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ”کیا بول رہے ہو جو گی سائیں، میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔“ ”تم محنت کم، باتیں زیادہ کرتے ہو۔ آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو۔“ خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر ہلایا۔ میں جانتا تھا کہ اب رات گئے تک کام میں بھار ہے گا۔ میرا وہ نانا دان دوست۔

شام ڈھل چکی تو میرے دل کے اندر میرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جھلکانے لگا، مگر جو میرے تاریک دل کو ابھال سکتا، وہ اچالا کہاں تھا میری قسمت میں۔ خانو بے چارہ دن بھر کام میں بٹھا رہا۔ میں نے سوچ کر رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برادری اور خدمت گزار کی سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ جھڑکا، جس سے گرانے والا بیماریا بدلے میں صرف زخم ہی پال سکتا تھا۔ رات ہوئی تو

اسٹیشن ماسٹر صاحب معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایت دیتے نظر آئے، مگر جانے کیوں اس رات مجھے اگلاز صاحب کی چال اور آوازیں وہاں تک نہیں اور کڑک مفلوک محسوس ہوئی، جوان کی شخصیت کا خاضہ تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ رک گئے ”تم سوتے نہیں ہو کیا، طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں، بس نیند آتے آتے آتی ہے۔“ وہ جھٹکے ہوئے انداز میں وہیں چھوڑتے پر میرے قریب بیٹھ گئے ”ہاں ٹھیک کہا تم نے، کبھی کبھی تو نیند بھی غریبی شہزادی بن جاتی ہے۔“ ”آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟“ انہوں نے ایک گہری سانس لی ”ہاں، اب تو ٹھیک ہی سمجھو، وہ کہتے ہیں ناں، درد کا حد سے گزر جانا ہی دوا ہوتا ہے۔ تم یہاں ملے ہو، اس لیے تمہیں نہیں بتا کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پرانے ملازمین سارے واقف ہیں اس کہانی سے۔“ میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دہائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظری کب آتا ہے بھلا؟“ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔“ اگلاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی ”بس بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس بد نصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا وقت بستر پر پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی الکھوتی بیٹی غمی شریا۔۔۔۔۔ بچپن ہی سے ہم دونوں کی جان۔۔۔۔۔ لاڈ اور نازوں سے پلی۔ اسکول کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ہر حصوں، ہر مقابلے میں اول۔ چندے آلتاب، چندے ہاتھاب۔ سچ پچھو، تو اس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی خوف زدہ ہو جاتے تھے، اس لیے جلدی

اس کے ہاتھ پہلے کر کے رخصت کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بہت سے رشتے آئے، مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی، جہاں ساس نندوں کا جھیلا بھی کم ہو، اور لا کامیابی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے شریا کو بہت نازوں سے پالا تھا۔ اور ہمیں یہ ڈر تھا کہ وہ روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار وہ رشتہ لانے والی نے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بتایا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی بیرون ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا۔ اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے لگا، جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان بیننگ کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا۔ اور شریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتے والی کاوری بچلایا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری شریا سے، ورنہ



ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا، مگر میری بی بی اس رشتے کو قبول کرنے میں ڈراچٹکھاری تھی۔ "میں نے حیرت سے اعجاز صاحب کی طرف دیکھا "مگر کیوں؟" اعجاز صاحب نے نظریں جھکا لیں "دراصل لڑکا کچھ کم ضرورت تھا، ہماری شریا کی دودھ جیسی شفاف و گت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولار رنگ اور نین نقوش بہت پچ محسوس ہوتے تھے۔" اعجاز صاحب کی بات سن کر مجھے ایک زور کا ہٹکا لگا "شریائے کلیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں۔۔۔۔۔" "شریاء کا فیصلہ وہی تھا، جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ بالآخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی ٹھہرا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آنسوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو ہلایا۔ "پھر آپ اتنے اُداس کیوں ہیں، انسان کا تو اندر خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بد صورتی کی توجہات پر جاتی ہے۔" مجھے لگا یہ سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے لمبی گہری آہ بھری۔ "ہاں امیری شریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم تو پہلے ہی سے شریا کے پیار میں دوبا تھا، مگر۔۔۔۔۔!" میں نے بے چینی سے پہلو ہلایا "مگر کیا؟" "مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو بھلا پھولا اور خوش دیکھ سکتے

ہیں۔ کلیم اور شریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، مٹکیرے مسکراہٹوں کے تھالے ہوتے، پہلوئے حور میں نگوار، جیسے فخرے کسے جاتے۔ لگ آ کر کلیم نے شریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا فتنہ شریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور شریا کے کردار میں کوئی ٹھوٹ یا کئی ہوگی، ورنہ اس جیسی پر پی چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم ضرورت کو کیوں قبول کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور شریا کی خوب صورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے گلے ملے، حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہونے لگا۔ شریا کی زہد کی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور شریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا چاہیے، پھر چاہے یہ جوڑ سماشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم شریا پر شک کرنے لگا۔ ڈراڈرا سی بات پر وہ اسے ڈھٹک کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن شریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نخل نخل تھا۔ اور۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔" اعجاز صاحب کی قوت گوئی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا "پھر کیا ہوا؟" "اور پھر شریا کے آنے کے دو روز بعد کلیم نے اسے طلاق بھجوا دی۔۔۔۔۔" میری آواز حلق میں اکٹ سی گئی "طلاق۔۔۔۔۔" "ہاں اطلاق۔۔۔۔۔ تین سال پہلے ہماری شریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت سارے شاکر تھے جی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر شریا سستی رہی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔" مجھے یوں لگا، جیسے اعجاز صاحب نے کوئی کند چھری ٹھیک میرے قلب میں اتار دی ہو۔ "کیا۔۔۔۔۔ شریا مر گئی؟" "ہاں، آج اس کی عسری بری ہے۔" مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اعجاز صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی بنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان مذاہب کا شکار ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک "پڑی زاد" کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھرم نا دیے بیٹھے ملتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بیٹھے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں معنی کی زحمت کی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی عالم دنیا کے پاس تھے، یعنی مجھے قبول کر بھی لیتی تو یہ جگہ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بدل صرف روپ ہے، ترازو کے ایک ہلارے میں خُسن ہو تو دوسرا بات تھی اسے متوازن کر سکتا ہے، جب دو خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سلسلا بٹھ رہی تھی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی ہلکی ہلکی آوازوں نے مجھے دوبارہ جگا دیا۔ صبح ہو چکی تھی، خانو مجھے بتا رہا تھا کہ "سامیج یہ بی بی کب سے آپ کے جاننے کا انتظار کر رہی ہے۔ کتنی ہے، سامیج کا بڑا غام بتا ہے۔ دعا لینے آئی ہے۔" میں نے چوتھ کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان زمین پر ڈھے گیا اور زمین لٹک سے جالی۔ میرے سامنے معنی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری بھروسہ ساز۔ وہی قراۃ العین۔۔۔۔۔ مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک۔ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشمہ اتار دے، مگر خانو جاچکا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہماری آواز میں کہا۔ "بی بی! اپنے چہرے سے اندھیرے کا پردہ ہٹا دو تاکہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری روح کے زخم دیکھ سکوں۔" مگر وہ رو پڑی۔ "نہیں سامیج جی امیری آنکھیں بے نور ہیں۔ آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے۔ میں زور سے چلا اٹھا۔ "کیوں۔۔۔۔۔ تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟ اگر دعا ہی کروانی ہے تو اپنی بیٹائی کی دعا کرواؤ۔" یعنی نظریں بچا لگی۔ "نہیں سامیج، جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں بیٹائی کا کیا کروں گی۔" میں اس کی بات سن کر سسک اٹھا۔ وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔ "سامیج جی! کیا ہوا، سب خیر تو ہے ناں۔۔۔۔۔ تم رو کیوں رہے ہو، کیا کوئی برا پہنا دیکھا ہے۔" میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر ٹھکا ہوا امیرے کانوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی شکل سے میں نے خانو کو سمجھا بھکا کر کام پر بھیجا، مگر خود میرا چین و سکون حریز رہا ہوا گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ بچنے کے بھگرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار، ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا، جیسے وہ خواب اُدھورارہ گیا ہو۔ شاید معنی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں، مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا، جس نے درمیان میں میری خند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا۔ سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب تمہارے خواب سچ ہونے لگتے ہیں۔ قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیے تھے۔ پہلا شریا اور کلیم کی کہانی بنا کر اور دوسرا یہ اُدھور خواب دیکھا کہ۔۔۔۔۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جانا چاہ رہی تھی کہ معنی اگر بیٹائی بننے کے بعد مجھے دیکھ لیتی، تو وہ ضرور رورور کر خدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھ ہی رہتی تو اچھا تھا۔ میرے اندر چلنے چھڑک جینے ہونے لگے۔ جیسے واقعی معنی نے مجھے دیکھ لیا ہو۔

میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ سامنے بھی ایک ایک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں ترپتے دیکھا تو بتا کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔ اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے ایک مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا پکڑا اٹھا اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور قشویں سے خانو کی طرف دیکھا۔ "تمہارے سامیج کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین غورا کیں دیتے تو جا رہا ہوں، مگر ہو سکے تو سامیج کو شہر کے بڑے اسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔" خانو نے تیزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ملنے والا۔

اگلے روز ہال میں ٹھونٹ کر رہے، میری سانس اکھڑنے لگی تھی، جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اسے بہت سی سلاخوں سے ٹکرا کر باہر نکلنا پڑ رہا ہو۔ میری نظر دھیرے دھیرے پھرانے لگی، تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو سامیج، ایک بار میری بات بھی مان لو، چلو کسی بڑے اسپتال چلے ہیں۔" میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو پانی میں مل کر پالی ہوتے دیکھے اور مسکرا دیا۔ میری آواز ڈک ڈک کر نکل رہی تھی۔ "کیوں ڈھونڈی کہیں کے۔۔۔۔۔ ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سامیج کی کرامات پر تمہارا چین اور اطمینان چٹا دیا؟ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سامیج اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ اور آج جب خود تمہارا سامیج بیمار پڑا، تم اسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک پھونک ہی میں ہو نہ ہو جاتی؟"

تیز بارش میں بیٹھتی ایک پکیر میں گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی، تو ایک ہچل سی چٹ گئی۔ کچھ مسافر اترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے ڈور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میری لمبی جنادھاری بالوں کی لمبیں بیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل چکی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مراقبے میں پڑا ہوا تھا، جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا ٹیلا ابھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اسے دبے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا، مگر وہ برستی بارش میں یونہی دھرم نا دیے بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تاکہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ قناعت اور غنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی، جیسے منہ پر اڑی ہو۔ اور پھر وہ ہکا بکا کھار کر یوں تو اس کی سترم آواز نے میرے وجود میں بھیجی سبھی غلیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ارد گرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس بیٹھی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں۔۔۔۔۔ یہ اُسی کی آواز تھی، جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سن سکتا تھا۔ میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ "مجھے بتا ہے کہ آپ اپنے ارد گرد خواہش کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے، مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے جب تک رہی ہوں درپردہ۔۔۔۔۔ میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ آپ کی دعا کا بڑا اجر چاہتا ہے۔ میں آپ سے اٹھا کرتی ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔" میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی خوب صورت انگلیوں کو حسب عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے، جنہوں نے کبھی میرا چہرہ منہ کر ایک مجسمہ تراشا تھا۔ میری بھٹی نظریں اس کے ہاتھ میں پائی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی، پہچانتی بھی کیسے۔ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میری لڑکی سانسوں کی آواز سن کر وہ گھبرا کر میرے ارد گرد قریب آ گئی "آپ ٹھیک تو ہیں؟" دفعتاً میری نظریں اس کی آنکھوں پر لگے کالے خشمے پر پڑی تو میرے اندر بے یک وقت کئی جھٹکے چلنے لگے۔ حسب توقع ایک چشمہ اس کی خوب صورت سرمئی آنکھوں کا پہرے دار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں خدا خواست معنی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ چیز بارش اس کا نازک وجود بھگوری تھی، میرا ہی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے وجود کے لیے پھرتی بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور بچے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی دوڑا تو بیٹھی بیٹھتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے منہ می میں لے کر مصل دیا ہو جیسے۔ اسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روک رکھا۔ بس زبان دانتوں تلے داب لی۔ مڑتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈنگائی، میں تڑپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو ٹھونکے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے مشغول رہ گئی اور پھر اس نے بے تابی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی "پڑی زاد۔۔۔۔۔ یہ آپ ہی ہیں ناں۔۔۔۔۔ آپ چپ کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟ بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔" میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت نہ تھی، تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ میں لڑکھڑا کر یوں گرا، جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے، مگر مجھے دنیا کی نظر سے گرنے کی پرواہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک لگاؤ سے بچنا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر بات قبول تھی، مگر اس کی نظر میں نفرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر تھا تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ "کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پڑی زاد صاحب۔۔۔۔۔ میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا۔" ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، اس پاس چلنے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ معنی وہیں ڈور بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی "مجھے جانے دو عدنان۔۔۔۔۔ اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تگائی دی۔ وہ نظر میرا چھپا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ میں بہت نڈھال اور بڑا گھائل ہوں عدنان۔ مجھے اور زخمی نہ کرو۔ میرا دم میرے اس آخری بھرم



کے ساتھ نکل جانے دو۔۔۔۔۔۔ عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی.....؟“ ”نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔“ عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ ”محبت نہیں کی، تو پھر یہ جوگ، تیاگ کیا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمائی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گروہ خود کھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چھین لیتے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سوپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندہ گی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بہرم آپ سے بڑے تھے اور آپ اسی کوچ مندر حار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟“ میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ”میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بہرے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ ماتکا، تو وہ مجھے دکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اُن مکت احسانات کے بوجھ تلے دبئی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان۔۔۔۔۔۔ میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیار بھری ایک نظر۔“ عدنان نے حتیٰ لچھ میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بہرم بھی آزمایا لیتے ہیں۔ وہ آرہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسب وعدہ آپریشن سے پہلے نو یارک نہیں پہنچے، تو یعنی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اس کا آپریشن تو کر دیا، مگر بینائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک دو سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔“ میں چلا اٹھا، ”مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“ ”تمہی عینی کی آواز میرے قریب سے ابھری۔“ وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد۔۔۔۔۔۔ آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے بڑ جائیں تو پھرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسہ بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔“ خانو نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرسے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دو ڈالو بیٹھ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی غصّے پانی کی آبشار تلے آ گئی۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے ہوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاهی زحلی جلی گئی ہو۔ میں اس کے ٹھوتے ہی کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ ”پری زاد“ میں گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، عقارت، حسرت یا نفرت سے منبرا۔ ایک پیار بھری نظر۔ میرے مقدر کی نظر۔۔۔۔۔۔ وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراجِ حسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔“ میں بھی کتنی بد نصیب ہوں۔ آپ نے سب سے چھپا کر جس محبت کو اپنے من میں دبائے رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے۔۔۔۔۔۔ تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔ اتنا کم زور سمجھ رکھا تھا آپ نے قرآن لعین کو۔“

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ضروری بات کہنی ہو، کوئی دھرم نہیں آتا ہو

اے آزاد و غنی ہو، اے واپس بلاؤ

میں نے کہا کہ میں نے اسے

کے لئے جو کہ ان کے لئے ہے

میں نے کہا کہ میں نے اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔

مکتبہ اہل بیت، قم، ایران

ہمیشہ رہ کر دعا گو رہو

بہارِ عربیہ کے شاعرانہ انداز

بہارِ حیات کی پیریں اٹھیں اور  
کسی کے پاس نہ رہیں کسی کے پاس نہ رہیں

کے کہہ کر وہ بڑھ کر کھڑی ہوئی۔

۳۳۔ تمہارے لئے ہے، تمہارے لئے ہے

سیکسٹ اور فی چھ، اس کو چھ

بیشتر دیر نرویدتا ہوں گی۔

(42)